اسداللہ خانِ غالبؔ مرحوم

اور

سلسلۂ غالبیات

کے

دوسرے مضامین

کالی داس گپتا رضاؔ

اسداللہ خان غالبؔ مرحوم

اور

سلسلۂ غالبیات

کے

دوسرے مضامین

کالی داس گپتا رضاؔ

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ ۔ بمبئی

عزیز گرامی

شین کاف نظام

(ولادت ۲۶ر نومبر ۱۹۴۷ء)

کے نام

آزادی کے بعد کے پہلے ہندو ادیب

اور شاعر جس نے مجھے متاثر کیا

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۱ء

مصنّف : کالی داس گپتا رضاؔ

پبلشرز : ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
جولی بھون ۱/۲، ۱۰ نیو مرین لائنز
بمبئی ۴۰۰۰۲۰

پرنٹر : ملٹی پرنٹ ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

فہرست

اسد اللہ خانِ غالبؔ مُرد

سیاحؔ کے نام غالبؔ کے تین خطوں سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

۲۲ر اپریل ۱۸۶۷ء

"بھائی! تم نے اخبارِ اطراف و جوانب میں میرا حال دیکھا ہوگا۔ میں اب محض نکما ہوگیا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔"

۲۹ر اپریل ۱۸۶۷ء

"پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتذار چھپا ہے، وہ تمہاری نظر سے گذرا ہے یا نہیں؟ نہ گذرا ہو تو اکمل الاخبار ماہ شوال کے چاروں ہفتے کے ورقے دیکھ لو، ایک ہفتے میں نکل آئے گا ——————"

۲۵ر اگست ۱۸۶۷ء

"بھائی! میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا کیا حال جانیں؟ ہاں! اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں، سو

اُن کے اخبار میں مَیں نے اپنا حال مفصّل چھپوا دیا ہے اور اس میں
مَیں نے عذر چاہا ، خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح
سے ـــ "

۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء کے خط سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ اعتذار ماہ شوال ۱۲۸۳ھ یعنی ۸ فروری تا ۷ مارچ ۱۸۶۷ء کے دوران کسی شمارے میں شائع ہوا تھا مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ اعتذار کی اصل عبارت کیا تھی۔ سہ ماہی " اردو " اورنگ آباد بابت اپریل ۱۹۲۹ء (ص ۱۷۷ تا ۱۷۹) میں غالب کی ایک تحریر " مرزا نوشہ غالب کا آخری خط " کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ تحریر سے ظاہر ہے کہ یہ وہ اعتذار نہیں جو اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار میں فروری / مارچ میں چھپا تھا بلکہ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو غالب نے اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار کے حوالے سے " دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار " کو برائے اشاعت بھیجا تھا : اگرچہ یہ ثابت نہیں کہ یہ چھپا بھی تھا یا نہیں۔ مگر تحریر یقیناً مارچ ۱۸۶۷ء کے بعد کی ہے :

" دیگر از خویشتم خبر نبود تکلّف برطرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ہجوم غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسب رابطہ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں بعد اصلاح بھیج دیے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ مَیں نے اُنھیں نہ اُنھوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبّت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن صاحبان بلاد دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہفتاد و یک سالہ

عمر کی کتاب میں سے فصلِ آخر کی حقیقت کیا ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعف سامعہ اور قلّت اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علّتیں روز افزوں رہیں۔ حسن حافظہ کا بطلان علاوہ، جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصّہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ مع دوات، قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں پرسش مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں۔ میں اُن کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گذر گیا۔ رعشہ، دوران و ضعف بصر یہ باران نوآمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔ صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر اُن کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے

تو تقاضا اور اگر نہ پہونچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گذاری میں کچھ قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل نکما ہو گیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقول خواجہ وزیر ؎

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا، اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

غالبؔ"

لیکن اس اعتذار کے باوجود لوگ انہیں خط لکھتے رہے اور شاگرد انہیں اصلاح کے لیے کلام بھیجتے رہے۔ یہی نہیں وہ خود بھی اصلاحِ سخن اور فکرِ شعر میں فعّال نظر آتے ہیں چنانچہ اپنے ایک خط بنام احمد حسین میناؔ مرزا پوری محررہ ۱۳؍ جولائی ۱۸۶۷ء میں لکھتے ہیں:

"مولوی فرزند علی صاحب اخگرؔ کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا ۔۔۔۔
فقیر تو اُن سے مل کر بہت خوش ہوا ۔۔۔۔ (وہ جب چاہیں اپنا کلام (برائے اصلاح) بھیج دیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

چند دنوں بعد جب میناؔ مرزا پوری کے خط کے ساتھ اخگرؔ کا خط مع غزل برائے اصلاح پہنچ گیا تو اس کے جواب میں اصلاح شدہ غزل واپس کرتے ہوئے مرزا (تقریباً آخر اگست ۱۸۶۷ء میں) لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ مرزا پور کیا آؤں، اب سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ جرأت ۔۔۔۔۔۔۔ دعائے مغفرت

کا خواہاں ہوں ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے[1]

لیکن یہ شعر غالب کا آخری کلام نہیں ہے۔ اب تک کا دریافت شدہ ان کا آخری کلام وہ قطعہ ہے جو انھوں نے اپنے خط مورخہ ۳ نومبر ۱۸۶۷ء بنام نواب کلب علی خاں، کے ساتھ بھیجا تھا۔ ظاہر ہے قطعہ اکتوبر کے آخر یا نومبر کے شروع میں کہا ہوگا۔ قطعے کے کل شعر ۱۵ ہیں۔

پہلا اور آخری شعر دیے جاتے ہیں :

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں

حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال

ثانیاً، دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم[2]

غالب خطوں کا جواب بھی آخر تک دیتے رہے چنانچہ یادگارِ غالب میں حالی رقم طراز ہیں :

"جس روز انتقال ہوگا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا، اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ

---

[1] "دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے" مرتبہ، کالی داس گپتا رضا ص ۳۶۷

[2] "دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے" مرتبہ کالی داس گپتا رضا ص ۳۶۵

اور ایک فارسی کا شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو! ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا"

آخر غالب، ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو، ہجری سنہ کے حساب سے ۷۳ برس ۳ مہینے اور ۲۲ دن کی عمر گذار کر دنیا سے رحلت کر گئے۔

معظّم زمانی بیگم عرف بگا بیگم دختر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اہلیہ باقر علی خاں کامل ابن زین العابدین خان عارف، جسے خود غالب اپنی بہو کی طرح بیاہ کر لائے تھے، بیان کرتی ہیں[۱]:

"کہ موت سے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا، تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ میرزا جیون بیگ (یعنی مرزا باقر علی خاں اور بگا بیگم کی صاحبزادی) کو بلاؤ۔ یہ عموماً انہیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ کلّو ملازم انہیں بلانے کے لیے محل سرا میں آیا تو وہ آرام کر رہی تھیں۔ بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے، جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں۔ ملازم نے واپس آکر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئے گی ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا، بے ہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خان اور حکیم احسن اللہ خان کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج کیے گئے، مگر بے سود۔ انہیں ہوش نہیں آیا، نہ اس کے بعد انہوں نے کوئی بات ہی کی ـــــــــ"

---

[۱] "ذکرِ غالب" اشاعتِ پنجم ص ۱۳۳ - ۱۳۴ -

غالب کی سالی بنیادی بیگم کے پوتے نواب خضر مرزا مرحوم (جنہوں نے لڑکپن میں غالب اور ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کو دیکھا تھا) غالب کے انتقال سے کچھ پہلے امراؤ بیگم کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں[1]۔

"مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ دادی اس وقت زنان خانے میں تھیں۔ اسی عرصے میں داروغہ کلّو کو انہوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا۔ گریہ ان پر طاری تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں ــــ"

غالب کے شاگردِ رشید میر مہدی حسین مجروح (۱۸۳۳ء تا ۱۵ مئی ۱۹۰۲ء) نے غالبؔ دوسرے ہی دن چند تاریخی قطعاتِ وفات کے ساتھ ایک مراسلہ اکمل الاخبار کو برائے اشاعت دیا جو ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :

"کیا عجب اگر آسمان درپے آزار ہے، بھلا اس سے کیا توقع آسودگی جس کا خود گردش پر مدار ہے ــــ دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اٹھائی ہے۔ کس منتخب روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخلِ برومندِ معانی کو بادِ خزانی سے گرایا، مہرِ سپہرِ سخندانی کو خاک میں ملایا، جو خسرو کے بعد ملک سخن کا خسرو مالک رقاب تھا، اس کا نامۂ عمر طے ہوا۔ جو میدانِ سخنوری کا شہسوارِ طلال رکاب تھا، اس کا رخشِ زندگی پے ہوا۔

ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا بیان کیا جائے، دریا کوزے میں کیونکر سمائے، حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب عمیم الاشفاقی میں

---

[1] "احوالِ غالب" دوسرا ایڈیشن۔ ص ۲۵، ۷،

لاجواب، خوان تحریر میں بے نظیر، صافی ضمیر، جادو تقریر، فارسی زبان میں لاثانی، اردوے معلیٰ کے بانی۔ افسوس جس کا شہباز خیال طائر سدرہ شکار ہو، وہ پنجۂ گرگ اجل میں گرفتار ہو۔ صد حیف! اس وسادہ آرائے سخنوری کو تختے پر لٹائیں، ہائے، اس رنگین سخن کو سفید کفن پہنائیں۔ جو ایک دم فراق احبا کی تاب نہ لائے اس کو یوں تنہا قبر میں چھوڑ آئے۔ اس غم سے سب کی حالت تباہ ہے ......"

"واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے صاحب فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سے آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا۔ اس دنیاے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آنکہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے مہر فلک کے ساتھ ہی اس خورشید اوج فضل و کمال کو زوال ہوا۔ یعنی اس سہ پنجی سراے بے بنیاد سے عدم آباد کی طرف کوچ کیا۔ نہ غرغرۂ نزع کی تکلیف پائی، نہ کشاکش جان کنی کی مصیبت اٹھائی۔ سب عمائد شہر بیرون دہلی دروازہ نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ بعد نماز کے حضرت سلطان نظام الدین قدس اللہ سرہ کی درگاہ میں پہنچایا اور اس گنج معانی کو تہہ خاک چھپایا۔ اس مجروح دل افگار نے یہ حال سراپا ملال اس لیے درج اخبار کیا تاکہ اس قدوۂ شعراء کے محبان باصفا حضرت مغفور کے مستغرق رحمت ہونے کی خبر پائیں اور چشم پُرنم سے اشک حسرت بہائیں۔

قطعۂ تاریخ[1]

کل مرقدِ استاد پہ افراطِ الم میں
ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غمناک
بولا ہے اگر فکر میں تاریخ کی مجروحؔ
کہہ دے "نہ یہی گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

۱۲۸۵ھ

سویم کے روز یعنی ۱۸ فروری ۱۸۶۹ء کو باقر علی خاں کاملؔ کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں شاداںؔ (۱۸۵۰ء تا ستمبر ۱۸۸۰ء) ابن زین العابدین خاں عارفؔ، نے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کو غالبؔ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ نواب صاحب کا خط" مع ہنڈوی یک صد روپیہ بابت وظیفہ ماہ جنوری، غالبؔ کی وفات سے صرف ایک گھنٹے پہلے ملا۔

خط یہ ہے[2]:

"بتاریخ ۱۵ فروری سنہ حال مطابق ۲ ذیلعقد روز دوشنبہ
وقت ظہر، جناب دادا جان صاحب قبلہ نواب اسداللہ
خاں غالبؔ عرف میرزا نوشہ صاحب نے اس جہانِ فانی سے

۱؎ مجروحؔ نے قطعے اور بھی کہے تھے مگر ترمیم و تنسیخ کے بعد یہی قطعۂ تاریخ لوحِ قبر پر کندہ کیا گیا۔ اس کی ترمیم شدہ شکل یہ ہے۔

کل میں غم واندوہ میں باخاطرِ محزوں ؛ تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ ؛ ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"
۱۲۸۵ھ

۲؎ مکاتیبِ غالبؔ۔ عرشی۔ حواشی ص ۱۸۹

رحلت کی۔ فدوی کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کس قدر رنج والم اس
سانحۂ جانگزا دجگر فراش سے لاحق ہوا ہے اور نیز دادی صاحبہ معظمہ
کا حال اس رنج سے عالم پیری میں ایسا ہو گیا ہے کہ گذارش نہیں
کیا جا سکتا ہے۔ حضور کا نوازش نامہ مع ہنڈوی یک صد روپیہ
بابت تنخواہ جنوری ۱۸۶۹ء کے ۱۵ فروری کو ایک گھنٹہ پہلے انتقال
دادا جان سے شرف صدور لایا تھا۔ رسید ہنڈوی واسطے اطلاع
حضور کے عرض کی گئی ــــــــــــــــــــ"

مجروح نے لکھا ہے کہ نمازِ جنازہ "بیرونِ دہلی دروازہ" پڑھی گئی تھی۔ حالی بھی یہی لکھتے ہیں مگر بہت کچھ اضافے کے ساتھ۔ یادگارِ غالب میں درج ہے۔

"مرزا کے جنازے پر جب کہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی
گئی، راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب
ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفیٰ خان، حکیم احسن اللہ
خان وغیرہم اور بہت سے اہلِ سنت اور امامیہ دونوں فرقوں
کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر
سلطان نبیرۂ بخشی محمود خان نے نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم
سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے، ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے
طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں، مگر نواب صاحب
نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہلِ سنت کے موافق ادا کیے گئے"

غالب، سلطان جی میں، چونسٹھ کھبا کے متصل، اپنے سسرال کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ میرزا حیرت نے چراغ دہلی (ص ۳۶) میں لکھا ہے کہ:

"مزار حضرت شاہ نظام الدین اولیا میں موجود ہے جس کے
گرد اُن کے ایک ہندو شاگرد نے پختہ چار دیواری کھچوادی

ہے۔ ——————————————— "

نہ صرف یہ کہ اس بات کی کسی اور ماخذ سے تصدیق نہیں ہوتی، غالبؔ کا کوئی ایسا (خصوصاً دہلوی) ہندو شاگرد بھی نظر نہیں آتا، جس کے لیے کہا جا سکے کہ وہ مالی طور پر پختہ چار دیواری 'کھچوانے کی استطاعت رکھتا تھا۔ آخر کار، ایک زمانہ بعد ہی سہی' غالبؔ کے بعض مداحوں نے "غالبؔ سوسائٹی" بنا کر چندہ جمع کیا اور قبر پر سنگِ مرمر کی چوکھنڈی تعمیر کرا دی جس کا افتتاح ۱۹۵۵ء کی ۱۵ فروری کو، کہ غالبؔ کا یومِ وفات ہے، ہوا۔

بیدلؔ اور غالبؔ

مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے [ولادت[۱] ۱۰۵۴ھ مطابق ۴۵-۱۶۴۴ء - (بہار اور بنگال کی سرحد پر واقع) بمقام اکبر نگر "راج محل"[۲]] ۴ صفر ۱۱۳۳ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۷۲۰ء کو دہلی میں وفات پائی۔ غالبؔ ۷۷ سال بعد ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ دورِ مشرقی تہذیب کا انحطاطی دور تھا۔ چنانچہ شاعری کو الفاظ کا طلسم اور معنی آفرینی کا مرقع بنا دینا اور اس پر ناز کرنا، اُس دور کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں مگر بیدلؔ نے اس طرزِ سخن

۱۔ سالِ ولادت" دو مادّوں" فیضِ قدس" اور" انتخاب" سے برآمد ہوتا ہے۔ مادّے مولانا قاسم درویش نے نکالے اور بیدلؔ نے نظم کیے۔

۲۔ توقیت بیدلؔ مختصراً یہ ہے: ۴۵/۱۶۴۴ء ولادت راج محل میں۔ تقریباً ۱۶۵۱ء میں والد کی وفات۔ تربیت چچا مرزا قلندر کے ذمّے۔ تقریباً ۱۶۵۵ء میں قرآن کی تعلیم سے فارغ۔ بعد ازاں علوم متداولہ سیکھے۔ شہزادہ محمد معظم کی ملازمت اور ترکِ ملازمت ہمیشہ کے لیے۔ ۲۰ سال (۱۶۶۴ء) کی عمر میں مجموعہ نظم و نثر 'چہار عنصر' تیار ہوا۔ اس میں درج ہے کہ وہ جن شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے ان کے القاب یا نام کشی نام یہ ہیں: شیخ کمال، شاہ ملوک، شاہ یکہ، شاہ فاضل، شاہ ابوالقاسم، شاہ کابلی، آخر الذکر سے ان کی ملاقات ۱۰۷۶ھ مطابق ۶۶-۱۶۶۵ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ شاگردوں میں شکر اللہ خان۔ (حاشیہ کا بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں جو انفرادیت پیدا کی ہے وہ انہیں کی ایجاد اور اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے بعد کے شاعروں نے کسی نہ کسی رنگ میں ان کی تقلید روا رکھی ہے، مگر کامیاب نہیں ہوئے اور غالبؔ تو اپنی ابتدائی عمر کے تقریباً پچیس سال بطور خاص بیدلؔ کے پیرو رہے اور معنی آفرینی پران کا ناز عہد فارسی گوئی میں بھی قائم رہا۔ چنانچہ جہاں بیدلؔ لکھتے ہیں :

بیدلؔ از فطرتِ ما قصرِ معانی ست بلند | پایۂ اوج سخن از کرسیِ اندیشۂ ما

غالبؔ نے بھی بصد فخر کہا ہے :

ہزار معنیِ سرجوش خاص نطقِ من است | از اہلِ ذوق دل و گوے از مسل برداشت

غالبؔ اگرچہ فطرتاً فارسی گو تھے مگر اُن کی باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز تقریباً ۱۸۲۲ء یعنی پچیس سال کی عمر سے ہوتا ہے اُس وقت تک وہ بیدلؔ کی پیروی ترک کر چکے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں بیدلؔ اور اسیرؔ و شوکتؔ کا رنگ بہت کم پایا جاتا ہے مگر ابتدا میں جو اردو شاعری انہوں نے کی وہ یکسر بیدلؔ کے زیر اثر کی نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ مکتوبہ ۱۸۱۶ء میں جبکہ اُن کی عمر ابھی ۱۸، ۱۹ سال کی تھی، ان کے یہ مقطعے اس کے غماز ہیں :

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) صوبیدار نواح دہلی از جانب سرکارِ اورنگ زیب، نظام الملک آصف جاہ اول، امانت رام امانتؔ، شیورام حیاؔ، اور سری گوپال تیزؔ شامل ہیں۔ وفات ۱۷۲۰ء بمقام دہلی۔ اپنے ہی گھر میں دفن ہوئے۔ بندرابن داس خوشگو، محمد عطا اللہ خاں عطاؔ، مغل خاں قابلؔ، معنی یاب خاں، آنندرام مخلصؔ، سروِ آزاد، میں لکھا ہے کہ ایک لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ چہار عنصر کے علاوہ، نکات، محیط اعظم، عرفانؔ، طلسمِ حیرت، طورِ معرفت اور غزلیات، رباعیات، قصائد، قطعات کا دیوان ہے اور بھی بہت کچھ ہوگا جس کی نشاندہی فی الحال نہیں کی جاسکی۔

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ سپئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

آخری دو مقطعوں میں پہلے اسد تخلّص تھا۔ ۱۸۲۱ء تک موجودہ شکل بنی اور غالب تخلّص ڈال دیا گیا۔ تاہم دل و دماغ پر رنگِ بیدل مسلط رہا۔ بیشتر نئی غزلیں غالب تخلّص کے ساتھ کہیں مگر اسد تخلّص ترک نہیں ہوا۔ چنانچہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) کے متن میں مزید یہ مقطعے ملتے ہیں اور ۱۸۱۶ء یا اُس سے پہلے کے کہے ہوئے مقطعے، جن میں بیدل سے عقیدت پائی جاتی ہے، بھی برقرار رہتے ہیں:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

دل کارگاہِ فکر و اسد بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدل ہے آئینہ

جوشِ دل ہے، مجھ سے حسنِ فطرتِ بیدل نہ پوچھ
قطرے سے میخانۂ دریائے بے ساحل نہ پوچھ

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسد آئینۂ پروازِ معانی مانگے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بکف، اسد
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

جوشش فریاد سے لوں گا دیتِ خواب، اسد
شوخیِ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

ہر غنچہ اسد، بارگہِ شوکتِ گُل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے، بیدل اگر آوے

طرزِ بیدل کی مدّاحی میں ایک اور مقطع بھی ہے جس میں غالب نے تخلّص کی جگہ اپنا پورا نام درج کیا ہے۔ اس شعر کی تمہید میں غالب اپنے مکتوب بنام مولوی عبدالرزاق شاکر میں لکھتے ہیں "... ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

خط پر تاریخ درج نہیں مگر یہ یقیناً مرزا کی زندگی کے آخری چند سالوں میں لکھا گیا تھا۔" ابتدائے فکرِ سخن" کے معنی یہی ہیں کہ شعر ۱۸۱۷ء (تذکرہ عمدۂ منتخبہ کی اوّلیں روایت ترجمۂ غالب) کے لگ بھگ کہا گیا ہوگا۔ مگر یہ سب شعر ۱۸۲۱ء تک ہی کے ہیں۔ اس عہد کے بعد اردو میں ایک شعر بھی بیدل کی مدّاحی میں نہیں کہا اور گلِ رعنا (انتخاب کلام از غالب ۱۸۲۸ء) سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک غالب، طرزِ بیدل کی تقلید قریب قریب ترک کر چکے تھے اگرچہ وہ بیدل کے اثر سے کلیتاً کبھی آزاد نہیں ہوئے۔ تخیل و تخیّل کے گل بوٹے اور خیالی مضامین کے ہوائی قلعے، کلام کا انتخاب کرنے کے

باوجود، کہیں نہ کہیں جھلک دکھاہی جاتے ہیں۔ غالب نے بعد کے زمانے میں بھی اپنے خطوں میں کئی مقامات پر بیدل کے شعروں سے فائدہ اٹھایا ہے مثلاً ۲۹ جون ۱۸۵۷ء کو اپنے خط بنام انوار الدولہ میں لکھتے ہیں :

"اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں وہ زور۔ سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے...... فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل ؎

جہدہا، در خورِ توانائیست ضعف یکسر فراغ می خواہد"

۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو سرور کو لکھتے ہیں "...... عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان ہے ؎ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

مرزا تفتہ کو ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں :

"میاں نہ مرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمہارے سمجھنے کو جگہ ہے، ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ میرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زیں ہوس ہا بگذر یا مگذر، می گزرد"

خط بنام حکیم غلام نجف خاں میں (اپریل ۱۸۵۸ء (؟)) لکھتے ہیں :

"خدا جانے پنشن جاری ہو گا یا نہ ہو گا۔ احتمالِ تعیش و تنعم بشرطِ تجرید صورتِ اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے ؎

نہ شام ما را سحر نویدی، نہ صبح ما را دم سپیدی
چو حاصلِ ماست ناامیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ"

انور الدولہ شفق کے نام کے خط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۵ء میں ہے :

"'ارنی' کی 'رے' کی حرکت و سکون کے باب میں قولِ فیصل یہی ہے
جو حضرت نے لکھا ہے . . . . . . مرزا عبدالقادر بیدل ہے

چو رسی بطور ہمت ارنی مگو و مگریز
کہ نیرزد ایں تمنا بجوابِ لن ترانی"

مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی (مہر اسداللہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء) کو لکھا
ہے :

"یہ جو قبلۂ اہلِ سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمتہ کے ہاں آیا ہے ہے
میراں کسے را و ہرگز میر
مجاز ہے ، امر بھی اور تعدیہ بھی ، متاخرین میں سے بھی عبدالقادر بیدل
کہتا ہے ہے
بمیرا ے سرکشِ ناپاک تا یک دم بیاسائی"

یہ مولوی ضیاء الدین وہی ہیں جنہوں نے مولوی امین الدین پر غالب کے ہتک عزت کے مقدمے میں غالب کے خلاف گواہی دی تھی ۔

مرزا ۱۹ یا ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے . . . . وہاں ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ قیام کر کے ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دہلی آئے ۔ کلکتہ کے ادبی معرکے میں جب ان کی مخالفت زیادہ بڑھی تو انہوں نے "آشتی نامہ" (جو بعد میں بادِ مخالف کے نام سے مشہور ہوئی) کے نام سے ایک مثنوی لکھی اور اس میں اپنے شعر پر ایک اعتراض کے جواب میں بیدل کا شعر[1] بھی شامل کیا اور کہا کہ اگر چہ

---

[1] خورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم ، طعنہ بر بے سر و سامانی طوفاں زدہ ، غالب کے اس شعر پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ شعر کی ردیف زدہ کا استعمال غلط ہوا ہے ۔ غالب نے مثنوی بادِ مخالف میں بیدل کا یہ شعر اپنی حمایت میں بطور سند پیش کیا ہے ۔ عاشقی ، بیدلے ، جنوں زدہ ۔ قدح آرزو بخوں زدہ

بیدل اہل ایران سے نہیں مگر وہ قتیل کی طرح نادان نہیں۔ بعد ازاں بیدل کی تعریف میں یہ شعر ہے ؎

ہم جہاں ایں محیطِ بے ساحل   قلزمِ فیضِ[1]، مرزا بیدل

مگر چند ہی اشعار کے بعد وہ اسی مثنوی میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ "طرزِ بیدل بجز تفنن نیست" اس مصرع کو ترکِ اتباعِ بیدل کا پیش خیمہ کہنا چاہیئے۔ یہ بات ۲۹ — ۱۸۲۸ء کی ہے۔ اس کے بعد کے غالب کے اشعار سے کہیں عقیدتِ بیدل کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ طرزِ بیدل کو خیرباد کہہ کر ظہوری، عرفی، نظیری کو رہنما بناتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ غالب اپنے کلام میں بے راہ روی پر غالب آ گیے۔

غالب نے یا تو نسخۂ بھوپال (قدیم ۱۸۱۶ء) کی پیشانی پر اپنے قلم سے بسملہ، یا علی المرتضیٰ، یا حسن، یا حسین کے بعد "ابو المعانی میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ" لکھا تھا اور ترقیمے میں "... فقیرِ بیدل اسد اللہ خاں ......" درج کیا تھا، یا پھر نقد و نظر کے مادے نے جو قدرت نے غالب کو ودیعت کیا تھا، یہ دن دکھایا کہ وہ مضامین اور نزاکتِ تخیل کو صرف اسی حد تک روا رکھنے لگے جہاں تک وہ قابلِ قبول ہو سکتے تھے اور بیدل کو جیسے بھول ہی گیے حتیٰ کہ 'پنج آہنگ' میں، جس کی داغ بیل تقریباً اسی زمانے میں پڑی تھی (اگرچہ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۴۹ء میں چھپی)، بیدل کا کہیں ذکر نہیں۔

اب غالب ۷۰ سال کی عمر کو تجاوز کرتے ہیں۔ اب وہ فارسی اساتذہ کے مقلدِ محض نہیں تھے بلکہ خود اساتذہ میں سے ایک تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک

---

[1] ۲۹-۱۸۲۸ء وہ زمانہ ہے جب غالب، بیدل اور طرزِ بیدل قریب قریب دونوں کو چھوڑ چکے تھے۔ یہاں بیدل کو 'قلزمِ فیض' محض اس لیئے کہا گیا کہ غالب، بیدل سے اپنی حمایت میں کام لے رہے ہیں ورنہ 'محیطِ بے ساحل' اور 'قلزمِ فیض' شاعرانہ مبالغے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی ترکیبیں ان کے قصائد میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ جیمز ٹامسن لفٹیننٹ گورنر اکبرآباد کے لیے دیکھئے 'آسماں پایہ جمس ٹامسن آں قلزمِ فیض'۔

تعصب سا بھی پیدا ہو گیا تھا وہ یہ کہ وہ ہندوستان کے فارسی سخنوروں میں، سوائے امیر خسرو دہلوی کے، کسی کو نہیں مانتے تھے اگرچہ جب ضرورت پڑتی تھی، تو ہندی فارسی گویوں کے اشعار اپنی حمایت میں استعمال بھی کر لیتے تھے۔ تسلیم کہ نباندانی میں اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان میں محاورے اور روزمرّے کا کچھ فرق ہونا قدرتی بات ہے مگر اس بات میں غلو کرنا نری حماقت ہے کیونکہ اعلےٰ درجے کے زباندانوں میں یہ فرق بہت کم رہ جاتا ہے، اور ہر اہلِ زبان کو مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ غالب نے اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیدل کی فارسی کو مستند فارسی نہیں مانا۔ مارچ / اپریل ۱۸۵۹ء (؟) کے ایک خط بنام سرور میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے سوا کوئی مسلّم الثبوت استاد نہیں ہوا .... (وہ) ہچشم نظامی گنجوی و ہمطرحِ سعدی شیرازی ہے ...... فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے ...... آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم، انہیں میں ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا! ہر ایک کا کلام بنظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ ——————"

منشی ہرگوپال تفتہ کو اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں 'نبرد' کا فاعل معدوم۔ 'حلقۂ زا' کی 'زے' پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصّہ میں لکھا کہ نہ 'حلقۂ را' درست نہ 'حلقۂ زا' درست مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے۔ خیر رہنے دو ——————"

پھر جولائی ۱۸۶۳ء (؟) میں سرور کو لکھتے ہیں:

"...... ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں ——————"

[اس میزان کے ذریعے فارسی کے مشاہیر شعرا کے نام گنانے کے بعد، غالب نے فارسی شاعری کی تین طرزیں ٹھہرائیں (۱) خاقانی، اس کے اقران (۲) ظہوری، اس کے امثال اور (۳) صائب، اس کے نظائر۔ ان تین طرزوں کے علاوہ ہندی فارسی گو شعرا کی طرز کے لیے کہتے ہیں :]

" یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے ——————————"

چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے یہ دونوں خط 'عودِ ہندی' میں شامل ہیں جو ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے تقریباً چار مہینے پہلے چھپی تھی۔[1] تمام تذکرہ نگار اور مشاہیر بیدل کی عظمت کے قائل تھے اور نظریۂ وحدت الوجود کے ماننے والے بلا امتیاز مذہب و ملت، بیدل کو ولی کا مقام دیتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی 'عودِ ہندی' کی اشاعت ہوئی اور لوگوں پر غالب کی اس تعریض کا حال کھلا، تو انھوں نے اس کا برا مانا مگر جلد ہی غالب کا انتقال ہو گیا اور معاملہ دب سا گیا۔ تاہم آگ لگی اور شعلے اٹھے جن کی خاکستر آج بھی کسی نہ کسی ٹھکانے موجود ہے۔ ایسے ہی چند مقامات کی نشاندہی یہاں کی جاتی ہے۔

اسرار احسن۔ محمد احسن بن محمد احمد صدیقی ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے تھے۔ صفی پور ضلع اناؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ احسان اللہ ممتاز اور گل محمد ناطق مکرانی کے شاگرد تھے۔ حیدر آباد دکن کی سرکار سے بھی وابستہ رہے بعد میں نواب

---

[1] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام کا خط 'اردوے معلّٰی' میں شامل ہے جو ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو یعنی مرزا کی وفات سے ۱۹ روز بعد چھپی۔

[2] احسن بلگرامی سے متعلق تمام معلومات 'غالب اور عصرِ غالب' مؤلفہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۹۲ سے لی گئی ہیں۔

صدیق حسن خان کے صاحبزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر ہوے۔ اگرچہ غالب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر خط و کتابت کے اور شاگردانِ غالب کے ذریعے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہتا تھا۔ احسن نے فارسی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں ارتنگِ فرہنگ کارنامہ فرہنگ صحیفۂ شاہجہانی اور اسرارِ احسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'اسرارِ احسن' قومی پریس لکھنؤ سے ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ شاید احسن اس وقت تک زندہ تھے۔ وہ ص ۵ پر مرزا بیدل کی مدافعت میں رقم طراز ہیں:

"ہمچناں غالب دہلوی در 'عودِ ہندی'، ہجوِ مرزا بیدل علیہ الرحمۃ رقم کردہ است و تبحرِ حضرتِ بیدل روشن تراز آفتاب است، وجودِ حقیقتِ آں ہجاگو از انشاے صحیفۂ شاہجہانی دریابند کہ پارہ ازاں بحکمِ ضرورتِ جواب گزاری ازجانب حضرتِ بیدل از رقعاتش رقم کردہ ام ———— "

'صحیفۂ شاہجہانی' دستیاب نہیں ہوئی ورنہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی جاتی۔

تمونۂ مغلوبیتِ غالب[1]۔ دس صفحوں کو محیط اس مختصر رسالے کا سرورق صرف یہ بتاتا ہے کہ اس کا نام " نمونۂ مغلوبیتِ غالب" ہے اور کہ یہ " در مطبع صدیقی واقع شہر بھوپال باہتمام مولوی بدیع الزمان صاحب طبع " ہوا تھا۔ تاریخِ طبع درج نہیں مگر قرائن سے ثابت ہے کہ یہ والا جاہ[2] نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں تصنیف ہوا۔ اس طرح اسے ۱۸۷۷ء یا اس سے کچھ عرصے بعد کی تصنیف کہا جاسکتا ہے، ترقیمے سے ظاہر ہے کہ رسالے کا کاتب " حامد علی الموہانی " ہے اور مصنف " شنکر پرشاد تخلص جوش ساکن بھوپال "۔ ص ۲ پر پیشانی کی سرخی یوں ہے:

---

[1] اس رسالے کا فوٹو اسٹیٹ مجھے عبدالقوی دسنوی صاحب کی وساطت سے ملا۔

[2] نواب صدیق حسن خاں کو 'والا جاہ' کا خطاب انگریزی سرکار کی طرف سے دربارِ قیصری منعقدہ ۱۸۷۷ء میں ملا تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نمونۂ مغلوبیت غالب بکرامت ولی کامل جناب مرزا عبدالقادر بیدل
قدس سرہ، بخواہش تصدیق از انصاف پروراں وطلبِ جواب از منکرانِ
ایں کرامت وغایت دیگر، حفظِ مخلوق از اغلاط ____________"

رسالہ اردو زبان میں ہے جس میں کثرت سے فارسی اور عربی جملوں اور شعروں کے اقتباس دیئے گیے ہیں۔ مصنف شنکر پرشاد جوش اردو، فارسی اور عربی کا بہت اچھا ادراک رکھتا ہے۔ فنِ شعر، زبان کے قواعد اور لغت سے بھی اُسے خاطر خواہ واقفیت ہے۔ رسالے کی پہلی چند سطور معنی خیز ہیں۔ غیر ضروری القاب اور الفاظ حذف کیے جاتے ہیں:

"قبل ازیں مرزا قتیل نافہم نے حضرت مولانا روم.... وحضرت امیر خسرو.... کے کلام پر از راہِ تعصّب بیجا اعتراض تراشے اور اپنی تصنیفات مثل 'شجرۃ الامانی' وغیرہ میں درج کیے۔ سو بزورِ کرامت بزرگان موصوف، مرزا غالب وغیرہ کے ہاتھ سے کلام اس کا جیسا مردود ہوا مثل حال مردودیتِ ابلیس کے شہرۂ آفاق ہے۔ بعد ازاں ویسی ہی حرکت مرزا غالب نے کی یعنی مرزا بیدل کے کلام کو از راہ اُسی تعصّب کے بے دلیل اور بے وجہ ناقص ٹھہرایا۔ چنانچہ 'عودِ ہندی' میں لکھا ہے کہ کلام مرزا بیدل کا دائرۂ طرزِ اساتذہ سے خارج ہے۔ پس بکرامتِ مرزا بیدل اب دیکھنا ہے کہ غالب کی مغلوبیت کس حد کو پہونچی اور کیا پردہ دری ہوئی نیز اس پردہ دری سے مقصود نفعِ خلق اللہ ہے کہ اغلاط سے محفوظ رہیں ____________"

پھر 'پنج آہنگ' پر تنقید کی گئی ہے اور غالب کے بعض فرمودات کو مصطلحات (وارستہ سیالکوٹی)، بہارِ عجم (ٹیک چند بہار) اور نوادر المصادر اور اشعارِ خاقانی و سیف الدین بخاری کی مدد سے غلط ثابت کیا ہے۔

آگے چل کر لکھا ہے:

"بعض معتقدینِ غالب یہ کہتے ہیں کہ زبانِ غالب لاجواب ہے اور کسی نے نہیں لکھی۔ سو حقیقتِ حال یہ ہے کہ کتاب آئینِ اکبری اور دفتر سوم ابوالفضل اور نگار دانش ابوالفضل اہلِ انصاف بغور دیکھ لیویں کہ مرزا غالب نے انہیں کتابوں کی کچھ خوشہ چینی کرلی ہے اور اس وقت جو (کوئی) کچھ خوشہ چینی ان کتابوں کی کرے گا، بے تکلف اس زبان پر قادر ہو جاوے گا۔۔۔۔۔ خود غالب کی (تحریر) میں الفاظ ایک طرف اکثر فقرات انہیں کتابوں کے موجود ہیں جیسا کہ یہ فقرہ انشائے غالب کا کہ 'بدرش سایہ از سر بگرفت'، نگار دانش ابوالفضل میں موجود ہے، اور یہ فقرہ کہ 'لختی باندیشہ فرو رفت'، گلستان کے باب پنجم کا ہے اور 'زبال روانی میکشاید' فقرہ مرزا بیدل کا ہے اور تیسرے رقعے میں جو لکھا ہے 'شنونده را دل بدرد آورد ن'، یہ سارا فقرہ پورا مصرع حضرت نظامی۔۔۔ کا ہے جو اس شعر سکندر نامہ میں موجود ہے۔

جوانے کہ در گوشش گرد آورد

شنونده را دل بدرد آورد

غرض کہ اس طرح فقرات عمدہ اس (غالب) کے کتبِ متداولہ میں موجود ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس طرح اور کئی مثالیں دے کر لکھا ہے کہ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے غالب کی "سرقیت، مہملیت نظم و ایجاد تراکیب" کا بقیہ حال ابھی لکھا جائے گا۔ اربابِ فہم و ذکا اس نمونے کو پیش نظر رکھ کر تھوڑے ہی غور سے غالب کے کلام سے بہت سی اغلاط نکال سکتے ہیں اور اگر نکال کر مشتہر کردیں تو موجبِ حفظِ خلائق ہوگا، اور "باعثِ حصولِ ثواب بجانب داری امرِ حق واہلِ یعنی مرزا بیدل علیہ الرحمتہ کی ہے۔

پس اب اہلِ انصاف سے امیدِ تصدیق بذریعہ مکاتبات ہے اور جانبداران
اور معتقدانِ غالبؔ سے طلبِ جواب ہے اور جواب اس کا خدمت میں
جناب مقطاب سیّد علی حسن خاں صاحب بہادر علی تخلّص کہیں فرزند
جناب معلّے القاب نواب والا جاہ امیر الملک سیّد محمد صدیق حسن خاں
صاحب بہادر فرماں روا ے ریاست بھوپال دام اقبالہٗ کے روانہ
فرمادیں ــــــــــــــــــــــــــــــــ"

اس اقتباس پر رسالہ ختم نہیں ہو جاتا۔ مصنّف نے بیدلؔ کی مدافعت میں پہلے کئی اور دلیلیں پیش کی ہیں اور آخر میں کہا ہے:

"کلام مرزا بیدلؔ کا اس وقت کے تمام اساتذہ کاملینِ ایران اور ہندستان
نے بخوبی دیکھا اور جانچا بجز مدح کے کوئی حرف کسی زبان سے نہ
نکلا یہاں تک کہ تمام کاملینِ ایران نے پہلوان الشعرا کا خطاب دیا اور
یہ شعر بھی عاقل خاں رازیؔ مدح میں مرزا بیدلؔ کی دیکھنا چاہیے ؎

زنیرنگِ بہارستانِ کلکِ میرزا بیدل
سوادِ کشورِ ہندوستاں رشکِ صفاہاں شد

بخلاف مرزا غالبؔ کے کہ تمام عمر اس پر اہلِ ہند اور اہلِ ایران اعتراض
اور ناپسندی ظاہر کیا کیے ــــــــــــــــــــــــــــــــ"

پھر فارسی کلام پر کلکتے کے ادبی معرکے، قاطع برہان کے ہنگامے، ناطق مکرانی اور ہادی علی اشکؔ لکھنوی کے اعتراض کا ذکر کیا ہے۔ پھر لکھا ہے۔

"کلامِ اردو اس کا سواے دو چار شعر کے کہ حال اس کی مسروقیت کا بھی
جداگانہ لکھا جاوے گا، آج تک شعراے اردو پسند نہیں کرتے۔
چنانچہ اسی وجہ سے کوئی شاگرد اس (غالبؔ) کا اردو میں اس کا مقلد نہیں
ہے اور دلیلِ ناپسندی ظاہر ہے کہ اردو میں اس قدر فارسیِ نامانوس

داخل کرنا خلافِ قاعدۂ بلاغت ہے ــــــــــــــــ"

آخر میں ایک حکایت لکھی ہے" مرزا ناطق مکرانی کے کلام پر ایک شخص نے لکھنؤ میں اعتراض کیا کہ ہم نے یہ محاورہ نہیں دیکھا"

مرزا نے نہایت غضبناک ہو کر چند بار کہا کہ 'توجہ دیدہ کہ ندیدہ'۔ پس اب یاد رکھنا چاہیے کہ ...... جس نے مرزا بیدل صاحب کے کلام پر اعتراض کیا ہے..... (اس کا یہ) جواب ہے 'توجہ دیدہ کہ ندیدہ'

کرامتِ بیدل یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ دریافت کرتے پر کسی کتب خانے میں بھی اس کا سراغ نہیں ملا۔ اس کا ذکر شنکر پرشاد جوش نے 'نمونۂ مغلوبیتِ غالب' میں کیا ہے۔ اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بھی غالب کے خلاف اور بیدل کی مدافعت ہی میں ہوگا۔ لکھا ہے

"صاحبِ رسالۂ کرامتِ بیدل' نے لکھا ہے کہ غالبِ الفاظ پرست، بے معنی نگار، اصل فنِ تحریر کو جس کو معاملہ نگاری کہتے ہیں، بمقدار مصنّف دستور الصبیان کے بھی نہیں جانتا کیونکہ دستور الصبیان میں کہیں نہیں ہے کہ دعوے کچھ اور، دلیل کچھ اور، مبتداء کچھ اور خبر کچھ اور.......

......"

جب یہ رسالے لکھے گئے یا شائع ہوئے، غالب اپنے دفاع کے لیے زندہ نہ تھے۔ لیکن یہ سب کر چکنے کے بعد خیال آتا ہے کہ طلسماتی زبان اور اَوَق معنی آفرینی کے سوا کیا بیدل کی شاعری میں اور کچھ نہیں ہے۔ جس سے غالب کچھ استفادہ کر سکتے؟ مختصراً عرض ہے کہ بیدل اپنے عہد کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ انسان تھے۔ اُن شعراء میں بیدل برگزیدہ ہیں۔ جنہوں نے حق کو مذہب سے بلند تر رکھا ہے

مے کشی کردیم و آسودیم از تشویش وہم
گرد چندیں مذہب از یک جرعۂ شرب نشست

جامِ حق کے ایک ہی گھونٹ سے مذہب کے توہمات کی گرد بیٹھ گئی۔ ہم نے یہ مے کشی کی اور آرام پایا۔ یہی نہیں بیدلؔ نے رسوم و ظواہر پر بھی پڑی لے دے کی ہے اور اس میدان میں وہ کڑی سے کڑی نکتہ چینی سے بھی باز نہیں آئے۔

این قدر ریشش چہ معنی دارد　　　غیرِ تشویشش چہ معنی دارد
آدمی خرس چہ ظلم است آخر　　　مردِ حق میش چہ معنی دارد
حذر از زاہدِ مسواک بہ سر　　　عقرب و نیشش چہ معنی دارد
بیدلؔ این ہمہ ریش است فش است　　　ملت و کیش چہ معنی دارد

یہ لمبی داڑھی سوائے تشویش کے اور کیا دے سکتی ہے۔ کیسا ستم ہے کہ انسان (واعظ) ریچھ کی حیثیت اختیار کر لے اور پارسا بھیڑ بن کر رہ جائے۔ مسواک دار زاہد کے سامنے عقرب و نیش کچھ نہیں۔ اے بیدلؔ! اب بات داڑھی اور طرّے کی ہے، ملت اور کیش کو کون پوچھتا ہے یا پھر ؎

بے نیازی از تمیزِ کفر و دیں آزاد بود　　　از کجا جوشید یارب اختراعِ ننگ ہا

یار در آغوش و سر کعبہ و دیرت کند　　　تا کجا رفتہ است از خود شوقِ بے پروا ما

بے خودی میں کفر و دیں کی تمیز کہاں رہتی ہے۔ پھر یہ کوتاہ بینی کیسی؟ محبوب سے تو ہم مدام ہم آغوش ہیں۔ پھر یہ دیر و حرم کے پھیرے کیسے؟ ہمارا شوقِ آوارہ ہمیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔

بیدلؔ کی اس بے باکی سے غالبؔ متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی کئی جگہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

سر از حجابِ تعیّن اگر بروں آید　　　چہ جلوہ ہا کہ بہ ہر کیش می تواں کردن

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　　حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

کفر و دیں چیست جز آرائشِ پندارِ وجود ــــ پاک شَو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود

خوش ساز ندی و جوشِ زندہ رود مشربِ عذلیش ــــ بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہب ہا

تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت ــــ جز گرمیِ افطار ندارد رمضاں ہیچ

یہاں بیدل اور غالب کا تقابل مقصود نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب نے جب پیرویِ بیدل ترک کی تو انہوں نے صرف اُن روشوں کو چھوڑا جو انہیں لفظوں کے خارزاروں تک پہنچاتی تھیں مگر اُن روشوں پر برابر چہل قدمی کرتے رہے جو مثبت فکر و معانی کے چمن زاروں کی سیر کراتی ہیں ہر عظیم شاعر کی طرح بیدل نے بھی شعر کو زندگی سے الگ نہیں ہونے دیا اگرچہ انہوں نے بیشتر، زندگی کے روحانی پہلو ہی کو پیش نظر رکھا۔ ایسا کرنے میں یہ ہوا کہ شعر دل کی دیواروں سے سیدھا نہ ٹکرایا بلکہ اس کو دماغ کے راستے سے دل تک پہنچنا پڑا۔ غالب نے سنگلاخ طرزِ بیدل کو تو چھوڑ دیا مگر وہ ان کی تفکیری روش کو نہ چھوڑ سکے اور آج جب ہم یہ کہہ کر ناز کرتے ہیں کہ غالب نے اردو ادب کو فکری شاعری سے روشناس کرایا تو لامحالہ اس کا کچھ نہ کچھ کریڈٹ ہمیں مرزا عبدالقادر بیدل کو بھی دینا پڑتا ہے جو طرزِ بیان و فکر میں غالب کے اوّلین رہنما تھے اور جن سے انہوں نے تقریباً ربع صدی تک ٹوٹ کر محبّت کی تھی لے

---

۱. بیدل نے اپنے سالِ ولادت کا قطعہ خود لکھا تھا ؎

بسالے کہ بیدل بملکِ ظہور ــــ ز فیضِ ازل تافت چوں آفتاب

بزرگے خبر داد از مولدش ــــ کہ ہم "فیضِ قدس" است و ہم "انتخاب"

۱۰۵۴ھ ۱۰۵۴ھ

غالب نے بھی اپنے سالِ ولادت کو رباعی میں نظم کیا اور بعینہٖ یہی پیرایہ اختیار کیا ؎

غالب چو ز نا سازیِ فرجام نصیب ــــ ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب

تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس ــــ ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظِ "غریب"

۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

والیِ لوہارو اور ۱۸۵۷ء

فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ والیِ فیروز پور جھرکا لوہارو (۲۲ دسمبر ۱۸۰۴ء) کا ایک مقامی عورت مُدّی سے تعلق تھا،[۱] جس سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک لڑکا چھوٹی عمر ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ دوسرا شمس الدین احمد خان تھا جو ۱۸۰۹ء میں تولّد ہوا تھا۔ ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ نواب احمد بخش خاں نے ایک ہم کفو بیگم بیگم جان سے شادی کر لی جس سے ۱۸۱۴ء میں امین الدین احمد خان پیدا ہوئے اور ۱۸۲۱ء میں ضیاء الدین احمد خان۔

نواب احمد بخش خان نے اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خان کی عادات و اطوار کو دیکھ کر حینِ حیات یہ فیصلہ کر دیا کہ فیروز پور جھرکا کی گدی پر شمس الدین احمد خان بیٹھیں اور لوہارو کی ریاست دوسری بیگم کے بیٹوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین

۱۔ گھاٹا شمس آباد ضلع گوڑگانواں کے منسارام نامی میو کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام مُوسی تھا اور دوسری کا مُدّی۔ مُوسی راجا بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنے ہاں رکھ لی تھی اور مُدّی نواب احمد بخش خاں نے جسے بہت بعد میں بہو خانم خطاب دے کر باقاعدہ بیوی بنا لیا تھا۔

احمد خان کے حصے میں آئے۔

نواب احمد بخش خان اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال کر گئے، اور جیسا کہ اندیشہ تھا، شمس الدین احمد خان معاہدے سے پھر گئے۔ بھائیوں کے درمیان زبردست کشمکش شروع ہوگئی۔ اسی اثنا میں ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو شمس الدین احمد خان کو پھانسی ہوگئی۔ فیروز پور جھرکا کا علاقہ بحق سرکار ضبط ہوگیا اور لوہارو پر دونوں بھائیوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ جب ضیاء الدین احمد خان بالغ ہوئے تو انہوں نے ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی بات چھیڑی۔ دونوں بھائیوں میں تنازعہ بڑھا۔ آخر کار ۱۸۴۸ء[۱] میں حکومتِ انگریزی نے فیصلہ کیا کہ امین الدین احمد خان والیِ ریاست لوہارو ہوں اور ضیاء الدین احمد خان کو ۱۸ ہزار روپے نقد سالانہ وظیفہ خزانۂ ریاست سے ملتا رہے اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس پر یہ لوہارو سے نقلِ مکان کر کے مستقلاً دہلی آرہے۔ اس طرح اگرچہ نوابی دونوں بھائیوں کے قبضے میں رہی مگر ایک کے حصے میں فخر الدولہ کا خطاب اور ریاست آئی اور دوسرے کے حصے میں وظیفہ، اور دونوں چین کی بنسی بجانے لگے۔ حتیٰ کہ مئی ۱۸۵۷ء کا زمانہ آن لگا اور ہنگامہ شروع ہوگیا۔ اس ہنگامے میں نواب امین الدین احمد خان والیِ لوہارو کا جو رول رہا اس کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں تاہم (ل) روزنامچۂ عبداللطیف (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ)، (ب) تصنیفِ غالب، دستنبو اور (ج) خطوطِ غالب میں کچھ تفصیل

---

[۱] اس سے پہلے ۷ اگست ۱۸۴۷ء کے احسن الاخبار میں یہ اندراج ملتا ہے:

عرض کیا گیا کہ نواب امین الدین خاں جاگیردار لوہارو کے علاقے سے بہت سے زمیندار منحرف اور سرکش ہو گئے ہیں۔ اس لیے شریروں اور فسادیوں کے انتظام و تادیب کی غرض سے نواب صاحب نے چھ سو پیادوں کو ملازم رکھ لیا ہے۔

ملتی ہے۔ انہیں کو رہنما بنا کر ذیل کی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔
عبداللطیف کا روزنامچہ اگرچہ چشم دید حالات پر مبنی ہے۔ مگر یادداشتوں پر منحصر ہے جسے بہت بعد میں سمیٹا گیا اس لیے معمولی اضافے بھی ہوتے رہے۔ مثلاً نواب علاءالدین احمد خاں علائی کی وفات کا ذکر ہے جو ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو ہوئی تھی۔ یا مولانا شریف حسین کی تاریخِ وفات ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء درج ہے۔
پہلے روزنامچے کے اندراجات دیے جاتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق ہنگامے کے روزِ اوّل سے آخر تک ہے۔ غالب کے یہاں سے اقتباسات بعد میں درج کیے جائیں گے:

(۱) ۱۹ رمضان، ۱۲ مئی

صبح کے وقت جب بادشاہ کو اصلاحِ ملکی کا خیال پیدا ہوا، فخرالدولہ مرزا امین الدین احمد خان بہادر اور میاں نظام الدین اور نواب مرزا ضیاءالدین احمد خان بہادر اور نواب حسن علی خان اور نواب احمد علی خان اور اعتمادالدولہ میر حامد علی خان بہادر اور نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان غالب اور نواب بدھن صاحب اور خان جہان خان اور ارادت خان اور مفتی صدرالدین خان اور کرم علی خان ایوانِ شاہی میں آداب بجانے کے لیے حاضر ہوئے اور زمین بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ہر ایک نے ایک ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لیے مرتبۂ "خانہ داری" سے یہ لوگ بہرہ اندوز ہوئے۔ نواب فخرالدولہ بہادر نے مگس رانی کا درجۂ بلند حاصل کیا۔

۱۹ شوال، ۱۳ جون

چونکہ بدذات باغیوں نے انگریز شیر مردوں کے مقابلے میں اپنی مکاری اور روباہ بازی سے نامردی کا ثبوت دیا۔ اس لیے

سب نے سمجھ لیا کہ اِن بدمست لوگوں سے لڑائی میں کوئی بڑا کام انجام نہیں پائے گا اور یہی بات بادشاہ کے دل میں بھی جم گئی۔ پس بادشاہ نے حسرت کے ساتھ آج شام کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کی۔ اوّلاً نواب زینت محل اور شاہزادوں سے دریافت فرمایا۔ پھر عمدۃ الحکماء حکیم احسن اللہ خاں اور نواب حنیف الدولہ میر عباس وکیل شاہی سے بھی رائے دریافت کی گئی۔ جب ان کی رائے سے اطمینان خاطر نہیں ہوا تو چند خاص امیرزادوں کو بھی بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ صمصام الدولہ نواب فرخ جاہ احمد قلی خاں بہادر، امیرالامراء نواب احتشام الدولہ انیس الرحمٰن خاں بہادر، مظفرالدولہ نواب سیف الدین حیدر خان بہادر، معین الدولہ نواب ذوالفقار حیدر نظارت خان بہادر، حافظ ندیم الدولہ محمد داؤد خان بہادر، نواب فخرالدولہ مرزا امین الدین احمد خان بہادر، اور نواب بدھن صاحب صاحبزادہ نواب امیر خاں کو بلوایا اور انجمن آراستہ کی۔

اللہ اللہ منتخب اشخاص دربار میں کھڑے ہوئے اور بادشاہ انکشاف راز کے لیے بیٹھے اور تقدیر نے مسکرا کر تماشہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں۔ بات جو زیرِ بحث آئی یہ تھی کہ اس طرف سے دل ہٹانا اور انگریزوں کی طرف جانا مناسب ہے۔ سب نے عرض کی کہ یقیناً اب ان تباہ کاروں کے ساتھ اس مقام پر رہنا اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا ہے اور اس جگہ سے اکبرآباد چلا جانا بہتر ہے۔ اللہ اللہ جب عقل نے صحیح تجویز کی طرف رہنمائی کی تو مقدر نے دل میں وسوسہ پیدا کر دیا۔ مکرّر امراء سے دریافت فرمایا گیا۔ جواب

میں انہوں نے پھر وہی باتیں عرض کیں۔ فرمایا کہ انگریزوں سے دوستی کی شکل کیا نکالی جائے اور کس طرح سکون بخش ثبات حاصل ہو۔ (حاضرین نے) عرض کیا کہ اگر یہ بات نہیں ہے، تو یہ چاہیئے کہ اوّل احوال تحریر کیا جائے اور جواب کے انتظار میں توقف فرمایا جائے۔ حتیٰ کہ طریقہ مہر و محبت پیدا ہو اور موافقت اور اتحاد کی صورت نکلے اور جواب مژدہ راحت لائے اور قاصد بشارتِ فرحت دے۔ اس وقت اس منزل کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ بادشاہ نے امیرزادوں کی رائے پر رضامندی کا اظہار کیا اور خط لکھنے کا حکم دیا۔ پس نواب گورنر جنرل بہادر اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو خط ارسال کیا گیا۔

۱۹ ذی قعدہ، ۱۳ جولائی

دربار کے منعقد ہونے کے وقت نواب فخرالدولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں اور نواب حسن علی خاں کو "امتیازی عصا" مرحمت ہوئے۔ اس عطیہ سے شرف امتیاز حاصل کرنے پر انہوں نے (بادشاہ کی) مدح و ثنا کی اور ایک ایک اشرفی بطور نذرانہ پیش کی۔

پوشیدہ نہ رہے کہ یہ عصا سلاطین صرف امراء کو عنایت فرماتے تھے اور وہ بھی ان معدودے چند کو، جو معتمد اور مخلص ہوں اس زمانے میں اس کی حقیقت خاص و عام سب پر روشن تھی۔ اس وقت تم بھی اس سے واقف ہو جاؤ۔ سنو۔ جس کسی کو یہ اعزاز بخشا جاتا تھا تو وہ بارگاہ میں اس پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اپنے اعزاز و مرتبہ کے مطابق سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا اور سکون

و اطمینان کے ساتھ مدح وثنا اور عرض ومعروض کرتا تھا۔...

۲۲ر ذی قعدہ، ۱۶ر جولائی

نواب فخرالدولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں کو فیروز پور جھرکہ کے واسطے فرمان آل تمغا تحریر کیا گیا کہ لوہارو باضافہ فیروز پور ہماری طرف سے دوامی عطیہ ہے۔ چاہیئے کہ خود انتظام کریں اور خود لشکر کا بندوبست کریں اور آج سے اپنے تئیں سلطنت کے خواص اور خانہ زادوں میں شمار کریں اور جو کام بھی کریں رضائے خالق کا خیال رکھیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے رہیں۔ نواب فخرالدولہ چونکہ ذی فہم شخص تھے، اس لیے انھوں نے اس کام سے انکار کیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت زمانہ کا عجب رنگ تھا کہ بادشاہ کی نعمت زحمت کا حکم رکھتی تھی اور زحمت نعمت کے برابر تھی۔ جیسا کہ مشہور ہے: اس کا پانی آگ تھا اور آگ پانی۔

۱۶ر ذی الحجہ، ۸ر اگست

نواب مرزا ضیاء الدین احمد خان بہادر کو عصائے سلطانی عطا ہوا۔ جب ان کو یہ اعزاز ملا تو نذر پیش کی۔

نواب مرزا ضیاء الدین احمد خان بہادر نیک سیرت اور ستودہ اخلاق رئیس تھے اور امتیازی شان کے مالک تھے۔ مردم شناس اور غریب نواز تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے عادات واخلاق پسندیدہ تھے۔ فارسی اور عربی علوم میں کمال حاصل تھا۔ نظم ونثر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

۲۳ ذی الحجہ، ۱۵ اگست[1]

لشکر کے لئے یومیہ خرچ ناگزیر تھا اور اُنہوں نے اس کے طلب کرنے میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا مغل شاہزادہ نے اُن کی تحریک پر قرض خواہی کی بزم منعقد کی اور مہاجنوں اور سوداگروں سے اس معاملہ میں گفتگو کی۔ جب اُس طرف سے انکار ہوا، تو اِس طرف سے جبر ہونے لگا اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے قرض طلب کیا گیا۔ نواب فخرالدولہ مرزا امین الدین خان بہادر سے بھی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ جب کئی بار یہ بات کہی گئی اور وہ ہر دفعہ انکار کرتے رہے تو "سر لشکر" جو مرزا مغل کے پہلو میں بیٹھا تھا، بولا کہ یہ کام میرے سپرد کر دیا جائے تاکہ (زبردستی) روپیہ وصول کروں۔ جوں ہی اس کی زبان سے یہ بات نکلی، نواب فخرالدولہ بہادر کی رگِ حمیت و شجاعت پھڑک اٹھی اور کہا کہ کس کی مجال اور طاقت ہے کہ مجھ سے بولے اور روپیہ لے۔ میں تنہا ذرا سی دیر میں سروں کو تن سے جدا کر کے فتراک میں باندھ لیتا

---

[1] یہاں ذیل کے اندراج کا کوئی محل نہ تھا۔ محض حاشیے میں اس لیے دکھایا گیا ہے کہ یہ غالب کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ملوّث ہونے کا ثبوت ہے :

۱۹ ذی الحجہ، ۱۱ اگست

"نجم الدولہ نواب اسد اللہ خان غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔

غالب فارسی زبان پر پورا عبور رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن اہلِ فارسی پر سبقت لے گئے۔ "

ہوں۔ اگرچہ کوئی بادشاہ زادہ ہی کیوں نہ ہو۔ میرا شیوہ رزم پیرائی ہے، نہ کہ دکانداری۔ جب غصّے میں ان کا رنگ سُرخ اور اُن کا حال دگرگوں ہو گیا تو (وہ) بد اندیش اس بات کو چھوڑ کر معذرت کرنے لگا۔ مرزا مغل نے بھی بہت دلجوئی کی اور محبّت و دلداری کے ساتھ اٹھا کر اپنی جگہ پر بٹھایا۔ وہاں سے اٹھ کر نواب فخر الدولہ بہادر اسی غصّے کی حالت میں بادشاہ کے پاس گئے اور مرزا مغل کی شکایت کی اور جگہ جگہ یہ بات کہی۔

فخر الدولہ بہادر، صاف طینت باوفا رئیس تھے اور شجاعت و مروّت میں نامور تھے۔ ان کے صاحبزادے فخر الدولہ بہادر نواب مرزا علاء الدین احمد خان بہادر اپنے باپ سے (بھی) بہتر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے کسوں کے لیے باعث راحت، اور ان کی مشکلات کو حل کرنے والے تھے۔ ان کی صحبت دل آویز اور ان کی تقریر دل انگیز تھی۔ مروّت، محبّت اور سخاوت تو ان پر ختم تھی۔ نثر نگاری میں یکتا اور شاعری میں اپنے زمانے کے پیشوا تھے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ نہ صرف مجھ کو (جسے اُن کے ساتھ رشتۂ محبّت و اخوّت تھا) ان کی جدائی کا رنج و غم ہوا، بلکہ ایک عالم پر چھا گیا۔ البتہ اللہ کا شکر ہے کہ اُن کے بڑے صاحبزادے اور جانشین مرزا امیر الدین احمد خاں بہادر ان باقیات صالحات سے ہیں۔

۱۳ محرم، ۴ ستمبر

نواب مظفر الدولہ بہادر سیّد سیف الدین حیدر خان نے عرض

کیا کہ باغیوں کے بعض پیادے اور سوار تیرہ باطن ہونے کی وجہ سے اعتماد الدّولہ میر حامد علی خاں سے بے جا وہم اور بدگمانی رکھتے ہیں، اور کسی کی پند و نصیحت کو نہیں سنتے اور اپنی ستمگری کی روش پر قائم ہیں۔ بادشاہ نے اُن کی حفاظت کا حکم دیا۔

معز الملک رضی الدّولہ بہادر مرزا محمد قدرت اللہ بیگ خان، امیر الامراء نواب احتشام الدولہ بہادر امین الرحمٰن خاں، نواب فخر الدّولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں، نواب صمصام الدولہ فرخ جاہ احمد قلی خاں، نواب مظفر الدّولہ بہادر سیّد ضیف الدّین حیدر خاں، نواب معین الدّولہ بہادر سیّد ذو الفقار حیدر نظارت خاں، اور سیف الدّولہ بہادر میر عباس اور ندیم الدّولہ بہادر حافظ محمد داؤد خاں اور مرزا عبد اللہ اور مرزا ابوبکر شاہزادہ کے ساتھ مشورہ کے لیے ایک جگہ بیٹھے اور بالاتّفاق اسی تجویز کے گوش گزار کرنے کے لیے شاہی خلوت کدے میں گئے اور اس طرح عرض کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات اور دقتوں کا وقت آنے والا ہے۔

(ب) جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے ناموران دانشمند امین الدین خان بہادر، اور محمد ضیاء الدّین خان بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور اُمیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رُخ کیا، جو اُن کی آبائی جاگیر ہے۔ پہلے

مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُرانوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، اُن کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے، جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر (اس) بے سروسامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خان بہادر نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے" ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصّہ مختصر سردارِ خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہِ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعے کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا

گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے، نذرِ غارت گری ہوئے۔ جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے، اور جو سامان یہاں محلات میں تھا، سب لُٹ گیا۔ بس اینٹیں، پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم وزر محفوظ رہا، نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے اس آغازِ ناسازگار کا انجام بہ خیر ہو۔ اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

یقیناً اکتوبر کی ۱۷ [۱۸۵۷ء] تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانش مندانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ مَیں نے (پہلے) کہا ہے، قلعے میں قیام کیا۔ اس واقعے کے دو، تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمٰن کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعے کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کرلی۔

(ج) "یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ قضا و قدر کے اُمور میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جائے تاکہ سب یک جا

باہم آرام سے رہو۔"

(ثاقب، مارچ ۱۸۵۸ء)

"سنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں) اور (ضیاء الدین احمد خان) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے، خدا سب کا بھلا کرے۔"

(غلام نجف خان، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

"امین الدین خان کو جاگیر ملنے کا حال ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ کیوں کر لکھوں .... اُن کو جاگیر اگست میں ملی۔"

(مجروح، بعد از جولائی ۱۸۵۸ء)

نواب احمد بخش خاں میں دو خوبیاں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ انگریزوں کے چاپلوسی کی حد تک فرماں بردار تھے۔ دوسری یہ کہ وہ نہایت جری، بے باک، بہادر مگر معاملہ فہم

۱؎ جیسا کہ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے خلتے پر دلّی چھوڑ کر امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خاں نے لوہارو کا قصد کیا اور رستے میں لُٹ لُٹا کے دوجانہ پہنچے مگر وہاں پکڑ لیے گئے اور خاصی مدّت انگریزوں کی حراست میں لال قلعے کے اندر رہے۔ آخر بے گناہ ثابت ہوئے اور جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد لوہارو جانے کی اجازت ملی۔

جنگ باز تھے۔ اِن دونوں خوبیوں نے اُنھیں انگریزی حکومت کا منظورِ نظر بنا رکھا تھا۔ ان کے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں کو بھی یہ دونوں خوبیاں ورثے میں ملی تھیں۔ اگرچہ وہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال (اکتوبر ۱۸۲۷ء) کے وقت صرف ۱۳ سال کے تھے تاہم انہوں نے اپنے والد کی روایت کو قائم رکھا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر ۴۳ سال تھی۔ ان کی معاملہ فہمی کا یہ عالم رہا کہ جیسے ہی بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان ہوا، وہ ہنگامے کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۲ مئی کو اپنے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں، غالب، آزردہ وغیرہ کے ساتھ ایوانِ شاہی میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہو گئے۔ "مگس رانی" کا درجہ بلند حاصل کیا۔ پھر ۱۳ جولائی کو "امتیازی عصا" بادشاہ کی طرف سے عطا ہوا۔ مگر ۱۶ جولائی کو جب بادشاہ کی طرف سے فیروز پور جھرکا (جو شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پانے کے بعد ضبط ہو گیا تھا) دوامی عطیے کے طور پر عنایت ہوا تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بہادر شاہ انقلابی تحریک کی رہنمائی کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے اور کہ ملکہ زینت محل، شہزادے اور بعض اُمراء جو سازشوں کا جال پھیلا رہے ہیں وہ کبھی اس تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اس طرح فیروز پور جھرکا پر اپنا قبضہ جما لینے کے معنی ایک ایسی مثال قائم کرتے کے ہوتے جو صریحاً انگریزوں کے حکم کی نافرمانی ہوتی۔ یقیناً ان کا وہی حشر ہوتا جو کئی دوسری ریاستوں کا ہوا تھا۔ مثلاً جھجر کے نواب عبدالرحمٰن خان، بلب گڑھ کے راجا ناہر سنگھ اور فرخ نگر کے رئیس احمد علی خان کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی ریاستیں ضبط ہو گئیں۔ بہادر گڑھ کے رئیس بہادر جنگ کی ریاست تو ضبطی میں آئی مگر ان کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا۔ انہیں پنشن دے کر لاہور بھیج دیا گیا۔ نواب امین الدین احمد خان بھی پکڑے آئے۔ قلعے میں بند بھی رہے مگر نو دس ماہ بعد اپنی تدبیر سے صاف چھوٹ گئے اور سب مراتب بھی بحال ہوئے۔

دوسری خوبی کے لیے روزنامچے میں ۱۵ اگست (۱۸۵۷ء) کا اندراج دیکھئے جب ایوانِ شاہی میں "سرلشکر" نے کہا کہ "نواب امین الدّین احمد خان سے میں روپیہ زبردستی وصول کر کے دکھاتا ہوں" تو نواب امین الدّین احمد خاں نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جو اُن کے بہادر باپ ایسے موقع پر دیتے۔

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہادرانہ روّیہ نواب امین الدّین احمد خان کے عہد تک ہی رہا۔ ان کے بعد انگریزی حکومت کی فرماں برداری تو باقاعدہ رہی مگر "شیوۂ رزم پیرائی" ختم ہوگیا۔

تصانیفِ شیفتہ

۱۔ اوّلین تصنیف (دیوانِ ریختہ)

نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ[1] کی اوّلین تصنیف کے بارے میں نظامی بدایونی[2] فرماتے ہیں :

"دیوانِ ریختہ اکیس[ii] سال کی عمر میں مرتّب فرما چکے تھے جو غدر ۱۸۵۷ء سے غالبًا دو تین سال پہلے مطبع آئینہ سکندری میرٹھ میں چھاپا گیا تھا۔ ایک غزل کا مقطع بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے ؎

اے شیفتہ اس فن میں ہوں میں پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس[ii] برس کی "

مولوی کریم الدین[3] لکھتے ہیں ۔

".... ایک تذکرہ گلشنِ بے خار اُنھوں نے شعرائے اردو

۱۔ فارسی میں تخلّص حسرتی تھا۔ ولادت ۱۸۰۶ء وفات ۱۸۶۹ء

۲۔ کلیاتِ شیفتہ و حسرتی مطبوعہ ۱۹۱۶ء ص ۳۷

۳۔ تذکرہ طبقات شعرائے ہند، سالِ تکمیل ۱۸۴۷ء ص ۳۷۰

کا اس طور پر لکھا ہے کہ حال سب شاعروں کا فارسی
میں اور اردو شعر اُن کے ۔ یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں طیّار
ہُوا تھا۔ دو دفعہ مولوی محمد باقر کے چھاپہ خانہ میں چھپ
چکا ہے۔ ایک دیوان اُن کا، میں نے سنا ہے کہ، طیّار
ہُوا ہے۔ اس سال میں یعنی ۱۸۴۷ء میں، درمیان
شاہجہان آباد کے، ان کے مکان پر مشاعرہ ہُوا کرتا تھا۔
اب چند ایّام سے کہ بسبب اس کے کہ وہ شاہجہان آباد
میں نہیں ہیں، موقوف ہوگیا ہے ...."

نظامی بدایونی مرحوم کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے :

(ا) دیوانِ ریختہ ۲۱ سال کی عمر میں مرتب ہو چکا تھا جس پر شعر دال ہے۔

؎ اے شیفتہ اس فن میں ہوں میں پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس۲۱ برس کی

(ب) یہ دیوان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو تین سال پہلے یعنی تقریباً
۱۸۵۴ء میں مطبع آئینہ سکندری میرٹھ سے چھپا تھا۔

مولوی کریم الدین صرف یہ کہتے ہیں کہ اُنہیں معلوم ہوا ہے کہ شیفتہ کا دیوان

۱۔ غالب۔ فکر وفن از ڈاکٹر شوکت سبزواری مطبوعہ ۱۹۶۱ء کراچی ص ۲۴۴ "..... اردو دیوان ۱۲۸۴ھ میں مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوا۔ راسخ نے اس مصرع سے تاریخ نکالی ع ہے لاجواب و دلکش دیوان شیفتہ کا" واللہ اعلم۔

تیّار ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے وہ ۱۸۵۴ء کی بات ۱۸۴۷ء میں نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لیے دیوان کے چھپنے کا ذکر نہیں کرتے۔ نظامی بدایونی نے نہ صرف چھپنے کی بلکہ چھاپہ خانے تک کی مکمل خبر دی ہے اس لیے میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ دیوان ۱۸۵۴ء کے لگ بھگ، مطبع آئینہ سکندری میرٹھ سے چھپا تھا، اپنی کم آگاہی تسلیم کرتا ہوں کہ نہ ہی میں نے یہ دیوانِ ریختہ دیکھا ہے اور نہ میرے کسی جاننے والے کی نظر سے گزرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظامی بدایونی نے بھی اسے بچشمِ خود ملاحظہ نہیں فرمایا۔

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ نے اپنا دیوانِ ریختہ کم عمری ہی میں ترتیب دے لیا تھا اور انھیں فنِ شعر میں اپنی پختہ کلامی کا احساس بھی ہوگیا تھا جس کا ردِّ عمل یہ شعر ہے[۱]

اے شیفتہ اس فن میں ہوں میں پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

گلشنِ بے خار میں شیفتہ نے باوجود رسمی انکسار کے اپنے کلام کا وافر انتخاب دیا ہے۔ کُل شعر ۱۴۳ ہیں۔ جو ۷۶ غزلوں سے منتخب ہوئے ہیں اور سب اشعار حروفِ تہجی کے مطابق درج ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ انتخاب مرتب شدہ دیوان سے کیا گیا ہے۔ قریب قریب یہ سب غزلیں کلیات میں درج ہیں[۲]۔ لہٰذا ان کی مدد

۱۔ یہ شعر اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ شیفتہ نے ۲۱ برس کی عمر میں اپنا دیوان ترتیب دے لیا تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ مصرعِ اوّل کچھ اس طرح کہہ سکتے تھے ع اے شیفتہ ہو بھی چکا دیوان مرتب ۔ یہ غزل کلیات ص ۹۴ میں موجود ہے اس کا ایک شعر گلشنِ بے خار میں بھی منتخب ہوا ہے غزل کا مطلع یہ ہے ع

مجھ تازہ گرفتار سے فریاد ز لبس کی
جان اڑ گئی بس کہنہ اسیرانِ قفس کی

۲۔ بعض اشعار میں معمولی ترمیم کی گئی ہے ۔

سے تقریباً ۶۰ غزلوں کا ایک دیوان 'کلیات' میں سے مرتب کیا جاسکتا ہے جو اگر اکیس[۲] برس تک کا فکر کردہ نہیں تو کم از کم ۲۶ برس کی عمر تک کا فکر کردہ ضرور ہے کیونکہ "گلشنِ بے خار" کی بنیاد شیفتہ نے ۲۶ برس کی عمر میں ڈالی تھی۔ خود شیفتہ نے گلشنِ بے خار کے ترجمے میں کہا ہے کہ یہ اشعار میں نے اپنے جمع کردہ دیوان میں سے دیے ہیں
مولوی کریم الدین (طبقات شعرائے ہند) نے شیفتہ کے ترجمے میں جو آٹھ شعر دیے ہیں وہ سب گلشنِ بے خار سے لیے ہیں لہٰذا دیوانِ اول ہی کا حصہ ہیں۔

۲۔ گلشنِ بے خار

میرے کتب خانے میں تذکرہ گلشنِ بے خار کے جو نسخے ہیں ان میں قدیم ترین وہ ہے جو مطبع نولکشور لکھنؤ میں اکتوبر ۱۸۷۴ء میں چھپا تھا۔ لیکن تذکرہ تو بہت پہلے چھپ چکا تھا۔ نظامی بدایونی فرماتے ہیں۔ (کلیات ص ۴۳) :

"۔۔۔ تذکرہ گلشنِ بے خار ۔۔۔ سفرِ حجاز سے پہلے
مکمل ہو کر شائع ہو چکا تھا یعنی ۱۲۴۸ھ (۳۳ -
۱۸۳۲ء) میں اس کی تصنیف شروع ہو کر ۱۲۵۰ھ
(۳۵-۱۸۳۴ء) میں ختم ہوئی اور وہ ۱۲۵۳ھ
(۳۸-۱۸۳۷ء) میں چھپ کر شائع ہوا"

خود شیفتہ نے دیباچے میں صرف یہ لکھا ہے کہ اس کام کی ابتداء ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) سے ہوئی اور انتہا ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) میں۔ مولوی کریم الدین نے بھی لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں طیار ہوا تھا" میری نظر سے اس تذکرے کی پہلی اشاعت نہیں گزری اس لیے صحیح سالِ اشاعت کا علم نہ ہو سکا مگر

یہ یقیناً ۱۲۵۰ھ اور ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ[1] کی درمیانی مدت میں چھپا تھا۔ ۱۸۴۷ء (تاریخ تکمیل طبقات شعرائے ہند) تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے تھے۔ مولوی کریم الدین نے اطلاع دی ہے کہ یہ تذکرہ "دو دفعہ مولوی محمد باقر (مولوی محمد حسین آزاد کے والد) کے چھاپہ خانہ میں چھپ چکا ہے۔"

شیفتہ اپنے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی کم وزنی کی بنا پر نہیں چاہتے کہ انہیں شاعروں کے زمرے میں شمار کیا جائے لیکن اس امید پر کہ اربابِ کرم جو عیب کو بھی ہنر سمجھ لیتے ہیں اور غلط کو بھی درست مان لیتے ہیں کرم فرمائیں گے اپنے کلام میں سے جو ان کے (شیفتہ کے) کردار کی طرح کچھ اچھا نہیں ہے تھوڑا سا پیش کر رہے ہیں۔

'یہ تھوڑا سا' کلام ۱۳۴ اشعار پر محیط ہے۔ یہ غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ میں سے، مومنؔ سے (شاید استاد ہونے کی وجہ سے) تقریباً آدھا اور غالبؔ اور ذوقؔ کے منتخب کلام سے بہت زیادہ ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مراتبِ سخن میں اگرچہ اُن کے یہاں ادائے خاص ہے لیکن ہر روش میں ان کی افتادِ طبع ایسی مناسب ہے کہ جس صنف میں بھی شعر کہتے ہیں وہی ان کی طرزِ خاص بن جاتی ہے اور کہ اگر آپ ان کے مجموعۂ نظم و نثر کو دیکھیں گے تو ان کے کہے کو مسلّم پائیں گے۔

اکثر دانشوروں نے کہا ہے کہ شیفتہ بہت منصف مزاج تھے۔ اوپر کی دونوں باتیں اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتیں۔ اسی طرح تنقید نگاروں کی اکثریت متفق ہے کہ گلشنِ بے خار کی روشنی میں شیفتہ اپنے وقت کے بہترین ناقد ثابت ہوتے ہیں مگر یہ قطعی غلط ہے۔ شیفتہ سرے سے تنقیدی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ میں نے گلشنِ بے خار کا کئی مرتبہ مطالعہ کیا ہے۔ انجام کار یہی تسلیم کرنا پڑا کہ

۱۔ شیفتہ اسی تاریخ کو سفرِ حجاز کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ تذکرہ اس سے پہلے چھپ چکا تھا۔

"(گلشنِ بے خار میں) .... ۲-۶۷ شاعروں کا ذکر ہے۔ چھ شاعروں کے باب میں تنقید کے نام پر ایک لفظ نہیں لکھا گیا۔ پانچ سات شاعروں کو چھوڑ کر جن لوگوں کے کلام پر شیفتہ نے کسی رائے کا اظہار کیا، وہ قدیم تذکروں سے منقول و ماخوذ ہے اور نصف درجن شعرا کے باب میں جہاں شیفتہ نے قدما کی رائے سے انحراف کیا ہے، انتہائی غیر معقول اور متضاد بیان دیے ہیں[1] .... "

اکتوبر ۱۸۷۴ء والا ایڈیشن ۲۷۰ صفحات کو محیط ہے۔

۳۔ رہ آورد

نظامی بدایونی سفرِ حجاز کے عنوان کے تحت (کلیات ص ۱۳) رقم طراز ہیں "نواب صاحب

۱۔ غالب نامہ جلد ۳ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۸۲ء ص ۸۸۔ غالب، حالی، شیفتہ اور ہم، از ڈاکٹر عابد پشاوری۔ نظیر صدیقی اپنے مقالے "قلمی تصویر" محررہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء (منقولہ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایک مطالعہ، مطبوعہ ۱۹۸۵ء مکتبہ اسلوب کراچی ص ۳۴-۳۳) میں لکھتے ہیں:

"... شادانی صاحب نہ تو گلشنِ بے خار کی انتقادی حیثیت کے قائل ہیں اور نہ شیفتہ کی انتقادی صلاحیت کے۔ انہوں نے شیفتہ اور گلشنِ بے خار کے بارے میں اردو نقادوں کے دعووں کو غلط ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ انہیں کا حصہ تھا اور بس ..... شادانی صاحب نے گن کر بتایا کہ شیفتہ کے ۶۷۶ میں سے صرف ۱۱۱ شاعروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ رائے بھی بڑی حد تک اگلے تذکرہ نویسوں سے ماخوذ ہے ____________ "

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا انتقال ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں ہوا۔

(شیفتہ) نے یہ مبارک سفر ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ (۱۲۵۴ھ) کو شروع کیا۔۔۔۔ (اس) کی تفصیل آپ نے اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے، جس کا فارسی نام 'رہ آورد' اور عربی میں 'ترغیب السالک الی احسن المسالک' ہے جو ان کی حیات میں طبع ہو چکا تھا[1]۔"

میرے کتب خانے میں اس سفرنامے کا ایک نسخہ موجود ہے۔ ایک عربی آیت کے بعد اس کا سرورق یوں ہے :

"الحمد والمنہ کہ رسالہ در مناسک حج موسوم

رہ آورد

از تصنیف جناب نواب مصطفیٰ خاں صاحب دام اقبالہ

۱۲۸۳ھ

در مطبع مصطفائی محمد حسین خان طبع گردید "

'خاتمۃ الطبع' یوں ہے :

"صاحبدلاں را مژدہ باد کہ نسخہ طیبہ مسمیٰ بہ ترغیب السالک الی احسن المسالک از افادات جناب تقدس مآب عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب محمد مصطفےٰ خاں بہادر مظفر جنگ متخلص بہ حسرتی بتاریخ بست و دویم (۲۲) شہر رجب المرجب سال یک ہزار و دوصد و ہشتاد و سہ ہجری در مطبع مصطفائی دہلی باہتمام محمد حسین خاں تحسین انطباع یافت ــــــــــــ"

۱۔ سفرنامہ فارسی میں ہے۔ نظامی لکھتے ہیں کہ "۱۹۱۰ء میں اس کا اردو ترجمہ سید زین العابدین صاحب بی۔ اے منصرم عدالت جی فرخ آباد نے شائع کیا جس کا نام سراج منیر ہے۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور ہاتھوں ہاتھوں فروخت ہو گیا۔" سراجِ منیر میری نظر سے نہیں گزری۔

دیباچے میں لکھا ہے:

"چون رو سے سخن با خاص و عام ست معانی بلند آوردن
راچہ محل و ایں رسالہ موسوم بہ رہ آورد شد۔۔۔۔۔۔۔۔
بتاریخ سعید دو شنبہ ہفتدہم ذی الحجہ سال ہزار و دویست
و پنجاہ و چہار آخر روز بآہنگ کسب سعادت
زیارت حرمین شریفین۔۔۔۔۔ از دالخلافہ شاہجہان آباد
نقل و حرکت اتفاق افتاد۔ نخست از خدمت سعادت آمود
۔۔۔۔۔ مولانا محمد اسحاق۔۔۔۔۔ ہمت درخواست۔۔۔۔"

ص ۲۹ اپر درج ہے:

"بتاریخ بست و سیوم ذی الحجہ سال ہزار و دویست و
پنجاہ و شش۔۔۔۔۔ وارد شہر مینو بہر شاہجہان آباد شدیم
۔۔۔۔۔ نخست از ہمہ۔۔۔۔۔ ملاقات۔۔۔۔۔ مولانا محمد اسحاق
بہرہ اندوز گشتہ۔۔۔۔۔ بکاشانۂ خود رسیدم۔ تمام مدت
سفر دو سال و شش روز است"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ثابت ہوا کہ

(ا) اگرچہ کتاب کے سرورق پر نام جلی حروف میں 'برہ آورد' ہی لکھا ہے
مگر اصل نام 'رہ آورد' ہے اور 'بہ' 'موسوم بہ' کا حصّہ ہے یعنی رسالہ
۔۔۔۔۔ موسوم بہ 'رہ آورد'

(ب) ترغیب السالک الی احسن المسالک، دوسرا نام ہے جو سرورق پر درج
نہیں صرف رسالے کے خاتمے میں آیا ہے۔ دیباچے میں بھی شیفتہ
(حسرتی) نے صراحت کردی ہے کہ اس رسالے کا نام 'رہ آورد'
رکھا گیا۔

(ج) حقیقتہ ۱۰ ذی الحجہ کو نہیں بلکہ ۱۷ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ کو سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے تھے اور ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ کو واپس آئے۔ یہ تاریخیں مطابق ہیں ۴ مارچ ۱۸۳۹ء اور ۱۶ فروری ۱۸۴۱ء کے۔ ہجری حساب سے مدّتِ سفر ۲ سال ۶ دن ہوئی اور عیسوی حساب سے ۱۱ یا ۱۲ دن کم ۲ سال۔

(د) جس روز دلّی سے روانہ ہوئے تو پہلے مولانا محمد اسحاق (شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے) کی خدمت میں حاضری دی اور وداع لی۔ جب حج سے واپس آئے تو بھی پہلے مولانا محمد اسحاق کے یہاں حاضری دی پھر اپنے گھر پہنچے۔

یہ سفرنامہ اس عہد کی تاریخ اور جغرافیے کا ایک دلچسپ باب ہے۔ اس میں بہت سے ذیلی عنوان قائم کیے گئے ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔ دلّی سے بمبئی تک کے حالات۔ بمبئی سے حدیدہ۔ حدیدہ سے جہاز میں روانہ ہونا اور جہاز کا تباہ ہو جانا اور کشتیوں کے ذریعے ایک ویران جزیرے تک پہنچ جانا۔ خدائی مدد سے دشوار کا آسان بن جانا اور مکّہ معظمہ پہنچ جانا۔ ذکر درمناسکِ حج مکّہ سے مدینہ تک۔ مدینہ کے مقاماتِ مقدّسہ کا حال۔ طائف۔ واپسی۔

کل صفحات ۱۵۲ ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ ۲۲ رجب ۱۲۸۳ھ کو چھپا تھا۔ یہ تاریخ مطابق ہے یکم دسمبر ۱۸۶۶ء کے۔

۴۔ دیوان و رقعاتِ فارسی

سرورق کی پیشانی پر آیت کے بعد مندرجہ بالا عنوان جلی حروف میں ملتا ہے پھر ذیل کی عبارت ہے :

" (دیوان ورقعات فارسی) جناب غفران مآب
مصطفٰے خان دہلوی متخلص بہ حسرتی
در پارسی و شیفتہ در ریختہ
رحمۃ اللہ علیہ
حسبِ فرمایش خلف الصدق حضرت مصنف
جناب نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد
ضلع بلند شہر دام ظلہم "
۱۸۸۷ء
در مطبع نیو امپریل پریس لاہور کسوتِ الطباع در برگرفت

سرورق کے علاوہ حصّہ اشعار (دیوان) میں کوئی دیباچہ، پیش لفظ یا خاتمۃ الطبع نہیں۔ دیوان کے خاتمے پر حالی کی لکھی ہوئی تقریظ ہے۔ پہلی دو سطریں یہ ہیں:

" تقریظے کہ خاکسار الطاف حسین حالی در زمانِ حیاتِ
مصنّف مغفور بریں دیوانِ بلاغت در سال ہزار و
ہشتصد و دو سی نوشتہ بود ـــــــــــ "

یہاں سال درج کرنے میں کاتب سے سہو ہوگیا : سال ہزار و ہشت صد و دو، یعنی ۱۸۰۲ء لکھا گیا۔ شیفتہ کا انتقال ستمبر۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں ہوا اور یہ تقریظ شیفتہ کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے 'سال ہزار و ہشت صد و شست و دو، ہوگا مگر 'شست' کا لفظ لکھنے سے رہ گیا۔ اس طرح قرینِ قیاس یہی ہے کہ تقریظ ۱۸۶۲ء میں معرضِ تحریر میں آئی ہوگی۔ بہرحال تقریظ میں کوئی کام کی بات نہیں کہی گئی محض فارسی انشا پردازی کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔

۱۔ شیفتہ کے بڑے صاحبزادے۔ ۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۹ء۔ رنگی تخلص کرتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔

دیوان میں ۱۷۸ غزلیں، ۷ متفرق شعر، مقطعات، ۱۸ رباعیاں (ایک رباعی کے پہلے دو مصرعے چھپنے سے رہ گئے ہیں) اور ۷ قصیدے (۶ قصیدے نعتیہ اور ۱ منقبتِ مرتضوی) ہیں۔ غزلوں میں ذیل کے مقطعے معنی خیز ہیں:

ص ۹ ماحسرتی ز شیوۂ غالب گرفتہ ایم — آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را[1]

ص ۲۸ ہوائے گلشنِ کشمیر حسرتی زانیست — ولش بہ ہند گشاید کہ آدمی خیز است

ص ۴۳ حسرتی نازشِ ہند است بشیریں سخنی — ایں چنیں طوطیِ خوش لہجہ بہر جا بنود

ص ۴۵ حسرتی بادہ مانشۂ عرفی دارد — می رسد دہلی اگر نازشِ شیراز کند

ص ۴۹ از حسرتی شنیدم در بزم نکتہ سنجاں — خوشتر ز طرزِ غالب طرزِ دگر نہ باشد

ص ۵۰ حسرتی ایں تازہ گل باید نثارِ دوستی — بو کہ مارا از نسیم کوے خود یاد آورد

ص ۵۱ غالب آں رنگیں نوا بلبل کہ ذوقِ نغمہ اش — ق — عندلیبان گلستاں را بفریاد آورد

ص ۶۲ اے حسرتی بپرس ز غالب کہ از غزل — آں کار می کند کہ بافسوں نکردہ کس

حصۂ اشعار (دیوان مع تقریظ از حالی) ۱۳۶ صفحوں کا احاطہ کرتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ "رقعاتِ فارسی" ہے۔ جس میں پہلے ۸ صفحے کا دیباچہ خود شیفتہ کا تحریر کردہ ہے۔ کل رقعات ۷۵ ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

دیباچے میں لکھا ہے کہ "اب جبکہ نظم پر سے توجہ ہٹ گئی ہے (یعنی دیوانِ شعر ترتیب دیا جا چکا ہے۔ ترجمہ از رضا)، نثر کی ترتیب کی خواہش ہوئی ہے"۔ اور یہ کام مندرجہ ذیل سال میں اور اس نہج پر شروع ہوا:

"در ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ — بستم آئین ایں نگاریں نامہ را

آئینہ طبعے بہارِ اندیشۂ — بو کہ روزے بیند ایں ہنگامہ را

ریختم سیارہ از نوکِ قلم — گلفشاں کردم صریرِ خامہ را

۱۔ مقطعِ غالب: آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست — آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

دریں دیباچہ ہمہ اشعارِ راقم است و در مکاتباتِ آتیہ
مخلوط، ہم از نامہ نگار است و ہم از سخن طرازانِ دیگر،
امتیاز را مصلحت اُفتاد کہ بر ابیاتِ خود علامتے نگارش
نہ پذیرد و شعارِ اشعارِ یاراں نام شاں باشد و بر حاشیہ
رقم شود .... و ایں مجموعہ لحنِ عراق نام یافت
و رقم سنج ایں نسخہ محمد الشہیر بمصطفٰے ..... متخلص بہ شیفتہ
در ریختہ و بحسرتی در فارسی ______"

یعنی دیباچے میں مندرج سب اشعار شیفتہ کے ہیں مگر آنے والے خطوں میں دیے ہوئے اشعار مخلوط ہیں یعنی کچھ شیفتہ کے کچھ دوسروں کے۔ جہاں مصنف کے ہیں وہاں کچھ صراحت نہیں کی گئی مگر دوسروں کے اشعار کے لیے حاشیے میں نام (تخلص) ظاہر کر دیا گیا ہے (متن میں یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں شاعر کے نام یا تخلص کا علم نہیں ہو سکا وہاں 'لاادری' اور 'لااعلم' جیسے لفظ لکھ دیے گئے ہیں خطوں میں مکتوب الیہ کا نام دے دیا گیا ہے اور جہاں پہلے ہی سے مسودوں میں مکتوب الیہ کا نام نہ تھا وہاں صرف نمبر شمار پر اکتفا کر لی گئی ہے) اور کہ اس مجموعے (رقعاتِ فارسی) کا نام 'لحنِ عراق' رکھا گیا ....

خطوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

بنامِ فضل حق	۱
بنام میر جستجو جان	۱
بنام مولوی فضل اللہ خاں	۱
بنام حکیم احسن اللہ خاں	۳
بنام مومن	۳
بنام نواب عبداللہ خاں	۷

بنام آزردہ	۷
بنام غالب	۱۰

۳۲

باقی ۳۲ خطوں کے مسودوں میں مکتوب الیہ کا نام درج نہ تھا۔ جس کی طرف شیفتہ نے دیباچے میں اشارہ کر دیا ہے۔

بعض خطوں کے آخر میں تاریخیں بھی درج ہیں۔ ایسے خطوں کی تعداد ۱۶ ہے تاریخ والا پہلا خط ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ کا محررہ ہے اور آخری تاریخ والا خط ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ کا۔ مطابق ستمبر/ اکتوبر ۱۸۲۸ء اور جنوری/ فروری ۱۸۴۲ء۔ ان میں غالب کے نام کے خطوں کا مقابلہ، پنج آہنگ میں مندرجہ خطوطِ غالب بنام شیفتہ سے کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ حصّہ رقعاتِ فارسی ۶۰ صفحوں کو محیط ہے

مکمل دیوان ورقعاتِ فارسی میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

۵۔ کلیاتِ شیفتہ و حسرتی

سرورق پر درج ہے:

"(کلیاتِ شیفتہ و حسرتی) جس میں دیوانِ ریختہ و دیوانِ فارسی ورقعاتِ فارسی شامل ہیں از تصنیفاتِ جناب غفران مآب نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد مصطفےٰ خاں صاحب مظفر جنگ دہلوی متخلص بہ حسرتی و شیفتہ مع دیباچہ وسوانح عمری مصنّف۔

از خاکسار نظامی بدایونی

حسبِ فرمائش جناب نواب حاجی محمد اسحاق خاں[1] صاحب
ریٹائرڈ جج صوبجات متحدہ و آنریری سکریٹری ایم۔ اے
او کالج علی گڑھ، تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر
خلف الصدق حضرت مصنف علیہ الرحمہ، باہتمام
نظام الدین حسین نظامی پروپرائٹر و پرنٹر نظامی پریس
بدایوں میں طبع ہوا۔ ۱۹۱۶ء ــــــــــــــ"

اس کلیات کے چار حصے ہیں اور چاروں حصوں کے صفحہ نمبر الگ الگ ہیں۔ تفصیل یہ ہے۔

I حضرت شیفتہ کے مختصر حالات ص ۱ تا ۹۰ (۲ صفحے صحت نامے کے زائد)
(اس میں شیفتہ کی کتابوں پر تبصرہ
اور فارسی کلام کا دوسرے مشاہیرِ
فارسی سے موازنہ وغیرہ شامل ہے)

II دیوانِ اردو ص ۱ تا ۱۲۴
(اس میں ۱۶۸ غزلیں اور ۱۲
متفرق اشعار درج ہیں)

(۱) دیوانِ اردو میں کہیں مومن یا غالب کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔
تعلّی میں ایسے اشعار ملتے ہیں ؎

دلّی میں تو شیفتہ ہے اُستاد — ہم قصدِ سوئے عجم کریں گے (ص ۹۰)
دیوان کو ہمارے بتوں کی نگاہ میں — اے شیفتہ وہ رتبہ ہے جو پید[2] و زند کا (ص ۴)

۱۔ جب یہ کلیات چھپا ہے اس وقت ان کے بڑے بھائی (سوتیلے) نواب محمد علی خاں کا انتقال ہوئے زمانہ ہو چکا تھا۔ سگے چھوٹے بھائی ان سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے۔
۲۔ وید و ژند۔

(ب) ص ۹۶ پر یہ شعر ہے ؎

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن۔ کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میرؔ پھرتی ہے

جس غزل کا یہ مقطع ہے اگرچہ اس میں "ہوائے شیوہ ہائے میرؔ کا" دور دور تک پتا نہیں تاہم دیوان کے بعض اشعار میں رنگِ میرؔ بھی تلاش کیا جاسکتا ہے جیسے ؎

نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب	یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے
پھر نصیحت کی کس کو تاب رہے	جو تہی دل کو اضطراب رہے
وہ جو اٹھے جان رخصت ہوگئی	شیفتہ! یہ کیا قیامت ہوگئی
پروانہ وار جلنا دستور ہے ہمارا	اس شمع رو پہ مرنا مشہور ہے ہمارا

III دیوانِ فارسی ص ۱ تا ۱۶۰ (۴ صفحے کا صحت نامہ زائد)
IV رقعاتِ فارسی ص ۱ تا ۶۶

III اور IV اصل میں تصنیف ہم (دیوان و رقعاتِ فارسی) ہے جسے مکمل طور پر کلیات میں ضم کرلیا گیا ہے مگر اس عمل کا اقرار نہیں کیا۔ شاید سوتیلے بھائی نواب محمد علی خاں کے نام کا اظہار منظور نہ تھا۔

استدراک: تلامذۂ غالب (دوسرا ایڈیشن ص ۳۳۵) میں لکھا ہے "گارسین دتاسی لکھتا ہے کہ انہوں نے ابن جوزی کے مولد۔ محدّث کا بھی عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، جو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ میری (جناب مالک رام کی) نظر سے نہیں گزرا۔"

فسانۂ غالب

'فسانۂ غالب' پہلی نظر میں ایک تحقیقی کتاب کے لیے موزوں نام نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ فسانہ (افسانہ) کا لفظ سنتے ہی قاری کا ذہن کسی ایسی گڑھی ہوئی کہانی کی طرف مبذول ہو جاتا ہے، جو غالب سے منسوب کر لی گئی ہو، مگر فسانہ کے معنی ماجرا اور واقعہ بھی ہیں اور تذکرہ بھی، جیسے اکبرؔ سے

حسینوں میں فسانہ ہے مری جادو بیانی کا

اس طرح جنابِ مالک رام کی اس کتاب 'فسانۂ غالب' سے مُراد کسی قصے کہانی کا بیان نہیں بلکہ تذکرۂ غالب ہے اور غالب کے جس فارسی شعر سے یہ نام اخذ کیا گیا ہے اس میں بھی اشارہ اسی طرف ہے ؎

بذکرِ مرگ شبی زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

گویا 'ذکرِ غالب' کے بعد 'فسانۂ غالب' یا غالب کا تذکرۂ مزید، حقیقت میں 'ذکرِ غالب' کے بعض مجمل بیانات کی توضیح و تشریح ہے جو حیاتِ غالب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے بے حد مفید ہے مگر حیرت ہے کہ جہاں 'ذکرِ غالب' کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں وہاں غالبیات کے شائقوں نے 'فسانۂ غالب' کی طرف وہ توجّہ

نہیں کی۔ میں نے یہ سطور اسی کتاب کو متعارف کرانے کے لیے لکھی ہیں۔

یہ کتاب پندرہ مضامین پر محیط ہے، جن میں کے دو مضمون "غالب سوسائٹی" اور "آزاد بنام غالب" کا براہِ راست غالب کے سوانح سے تعلق نہیں ہے۔ "قتیل پنجابی الاصل تھا" بھی اس زمرے میں آسکتا ہے مگر قتیل کا نام غالب سے کچھ ایسا جڑ گیا ہے کہ قتیل کے بارے میں کچھ لکھنا گویا اس بات کو دعوت دینا ہے کہ کچھ غالب پر بھی لکھا جائے۔ اس لیے اس کی شمولیت غالب کے سوانحی مضامین میں نازیبا نہیں معلوم ہوتی۔ اس مضمون میں مالک رام صاحب نے برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد قتیل کا صحیح شجرۂ نسب، نام اور جائے ولادت کی نشان دہی کی ہے۔

دیگر بارہ مضمون، غالب کے سوانح سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے اتنے اہم ہیں کہ 'ذکرِ غالب' میں ان کے بیشتر بیانات آجانے کے باوجود تفصیل کے لیے ان کی شدید جداگانہ ضرورت باقی رہتی ہے۔

کتاب کا متن "توقیتِ غالب" سے شروع ہوتا ہے۔ غالب کی زندگی سے ایک ہی نظر میں متعارف ہونے کے لیے یہ باب نہایت مفید ہے۔ یہ غالب کے دادا قوقان بیگ خان سلجوقی کے ورودِ ہند (لگ بھگ ۱۷۵۰ء) سے شروع ہو کر غالب سالی کے بیٹے عارف کے چھوٹے صاحبزادے حسین علی خان شاداں کے انتقال (۷، ستمبر ۱۸۸۰ء) پر ختم ہوتا ہے۔ گویا ۱۳۰ برس پر محیط ہے۔ توقیت محنت اور بصیرت سے تیار ہوتی ہے۔ یہاں بھی دو ایک مقامات محلِ نظر ہیں۔ جیسے مولوی معظّم کے مکتب میں تعلیم (۱۸۱۰ء) قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات (۱۸۰۹ء ــ ۱۸۱۰ء) کے بعد درج کرنا چاہیئے تھا (ص ۱۲) خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۵ ہجری درج ہو گیا ہے جب کہ یہ عیسوی ہے یہ سہوِ کاتب ہے (ص ۱۴) لطائف غیبی از میاں داد خاں سیّاح ۱۸۶۵ء

میں نہیں بلکہ ۱۸۶۴ء میں تصنیف ہوئی (ص ۲۱) غالب کی تصانیف میں دعاے صباح ۱۸۶۶ء کا ذکر نہیں (ص ۲۳) وغیرہ۔

تاریخِ ولادت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مضمون ان حضرات کے دلائل کے رد میں ہے جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی ولادت کی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کے علاوہ کوئی اور ہے۔ اس مدلل مضمون کا نتیجہ یہ ہے کہ "غالب کی تاریخِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ" تھی اور "اس کے مقابل عیسوی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تھی اور دن چہارشنبہ (بدھ وار)"۔

ایک فارسی خط کی تاریخ اس سے قطع نظر کہ یہ خط غالب کی زندگی پر ایک خاص زاویے سے روشنی ڈالتا ہے، متنازعہ فی بات خط کی تاریخ کا سال ہے جو پڑھنے میں ۱۸۰۴ء آتا ہے مگر غالب کے سال ولادت کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ وہ سات سال ہی کی عمر میں یہ خط لکھ سکتے۔

مالک رام صاحب لکھتے ہیں۔

> "میں اسے ۱۸۴۰ء کی تحریر مانتا ہوں اور یہی میں نے 'ذکرِ غالب' میں بھی لکھا ہے بیشتر پرانی قلمی کتابوں اور تحریروں میں کتابت کا سال یونہی لکھا ملتا ہے کہ سال کے دو ہندسوں کے دو ٹکڑے خاصے فاصلے سے لکھے گئے ہیں اور سنہ کے نون کا نقطہ دونوں کے درمیان آگیا ہے مثلاً ۱۲۲۵ھ لکھنا ہے تو اسے یوں لکھیں گے ۱۲۰۲۵ھ ..... میرے پاس پنج آہنگ (غالب) کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کا سالِ کتابت بھی ۱۸۴۰ء ہے اور یوں لکھا ہے ۱۸۰۴۰

یہ کہنا درست ہوگا کہ بعض پُرانی کتابوں میں کتابت کا سال یوں لکھا ملتا ہے مگر 'بیشتر' میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے کتب خانے کے تقریباً سو سے زیادہ مخطوطوں کے ترقیمے دیکھے صرف ۲ میں سال کتابت اس طرح پایا، لیکن ہوسکتا ہے کہ اُن کے مخطوطوں میں بیشتر ایسے ہی ہوں۔ اس تحریر کے آخری سنہ کو سہوِ کتابت سے ۱۸۰۴۰ء کی جگہ ۱۲۰۴۰ لکھ دیا گیا ہے۔ اسے درست کرلینا چاہیئے۔ بہرحال مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ قلمی کتابوں میں سالِ کتابت اس طرح لکھا ملتا ہے اور کہ اس خط کا سالِ کتابت، بگمانِ غالبؔ، ۱۸۴۰ء ہی ہے۔

میرزا یوسف

۱۴ صفحوں کا یہ مضمون میرزا یوسف برادرِ غالبؔ کے احوال پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ کلیاتِ نثرِ غالبؔ، کارنامۂ سروری، اردوئے معلّٰی، باغ دودر، خدنگِ غدر، غدر کی صبح وشام، احوالِ غالبؔ، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، مکاتیبِ غالبؔ، دیوان معروف تو وہ ماخذ ہیں جو چھپ چکے ہیں اور عام طور پر دستیاب ہو سکتے ہیں مگر اس قلمی کتاب (جسے میں نے اب 'تحفۂ غالبؔ' کا نام دے رکھا ہے) اور قومی دفتر خانۂ ہند (NATIONAL ARCHVIES OF INDIA) میں دفن شدہ مسلوں کی ورق گردانی کون کرتا۔ تو یہ کام کتاب کے مصنف نے کیا اور نتیجے میں ایسا مواد آپ کے سامنے پیش کردیا ہے جو کوہ کنی کے بعد ہی ہاتھ آسکتا ہے۔ اس مضمون سے بجا طور پر بہرہ ور ہونے کے لیے آپ اسے خود پڑھیئے۔

مُلّا عبدالصمد

اس موضوع پر قاضی عبدالودود اور مصنّف 'فسانۂ غالبؔ' میں خوب بحثا بحثی ہو چکی ہے، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، یعنی آپ کا جی چاہے تو مان لیجئے کہ غالبؔ نے مُلّا عبدالصمد سے اوایل

عمر میں ۲ برس فارسی سیکھی تھی، نہ ماننا چاہے تو انکار کر دیجئے۔ تاہم یہ مضمون پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے کیوں کہ اس میں ان تمام باتوں کا جواب دے دیا گیا ہے جو ۱۹۷۷ء تک اس موضوع پر لکھی گئی تھیں۔

حالی، یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ 'مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے' چونکہ لوگ مجھے بے اُستادا کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی ...."

عرشی صاحب مرحوم (دیوانِ غالب اردو نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی ص ۷)

حالی کی مندرجہ بالا عبارت یعنی گفتۂ غالب "مجھ کو مبداء فیاض.... ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے ....." کو درج کرنے سے پہلے لکھتے ہیں کہ "..... فی الحقیقت یہ (عبد الصمد کی) شخصیت افسانہ تھی جسے ازراہِ مصلحت میرزا صاحب نے پیش کر دیا تھا..................."

مگر حالی کی اپنی رائے کو گول کر گئے۔

"مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی.........."

مالک رام صاحب حالی کی رائے کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ اس سے

کہیں زیادہ اہم یہ بات ہے کہ غالبؔ کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالیؔ نے اس بات کی زور دار تائید کی کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا۔" قاضی صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ یہ محض غالبؔ کے کذب کی تائید ہے جو حالیؔ کو نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ میں نے جواب میں قاضی صاحب کو خود انہیں کے الفاظ دُہرا دیے جو انھوں نے میرے ایک خط میں لکھے تھے کہ جھوٹا آدمی بھی ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتا۔

میری رائے میں حالیؔ کے مندرجہ بالا بیان کو (اور شیفتہؔ کے حوالے سے دیے ہوئے فارسی خط، "ملّا عبدالصمد بنام غالبؔ" کو محض کذب کی تائید کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کہیں کوئی سچائی ضرور ہے۔

غالبؔ کی مُہریں

اس مضمون میں مصنّف نے غالبؔ کی اب تک کی معلوم ۶ مُہروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان سے نتیجہ نکالا ہے کہ غالبؔ کی ہر مُہر "اُن کے ماحول، ان کے خیالات اور عام حالات" کی ترجمان ہے۔ مُہروں پر یہ سال کندہ ہیں (۱) ۱۲۳۱ھ، (۲) ۱۲۳۱ھ (۱۲۲۱ھ سہوِ کتابت ہے) (۳) ۱۲۳۸ھ (۴) ۱۲۶۷ھ، (۵) ۱۲۶۹ھ (۶) ۱۲۷۸ھ۔

گویا ۱۲۳۱ھ میں دو مُہریں تیار کی گئیں ایک "اسداللہ خاں عرف میرزا نوشہ" اور دوسری "اسداللہ الغالب"۔ پہلی مُہر سے متعلق لکھا ہے کہ "اس مُہر سے اُن کی اس زمانے کی سرمستی و رنگینی، رندی و ہوس پیشگی بدرجہ اتم ظاہر ہے۔" دوسری مُہر کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ "مُہر محض سجع ہی نہیں، بلکہ ان کے دلی خیالات و متعقدات کی مظہر ہے۔" یعنی ایک ہی سال میں دو مُہریں، ایک سرمستی و رنگینی، رندی و ہوس پیشگی کی نمائندہ اور دوسری کی بنا، حضرت علیؓ کا لقب (جن سے غالبؔ کو والہانہ

عقیدت تھی، عجیب سی بات ہے مگر جواں سالی میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

نواب شمس الدین خان

ولیم فریزر کے قتل اور اس کے قاتل پر یہ مضمون پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ شروع سے آخر تک اسے ایک ہی نشست میں پڑھے بغیر چارہ نہیں۔ مضمون اس قدر مربوط ہے کہ یہ قتل و خون اور سزا و جزا کی ایک داستان معلوم ہوتا ہے، جیسے کسی نے ایک دلچسپ افسانہ تخلیق کر دیا ہو، مگر جب یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے دیوانِ معروف، مرقعِ الور، اردوئے معلیٰ، کلیاتِ نثرِ غالب، کارنامۂ سروری، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، کرنل سلیمان کی مشہور انگریزی کتاب، تاریخ صحافت اردو، مکاتیبِ غالب اور سخنِ شعراء سے کم کم اور قومی سفارت خانۂ ہند کی تنگ و تاریک فائلوں سے بیش از بیش مواد اکٹھا کر کے یہ ۲۴ صفحات لکھے ہیں تو منہ سے بے اختیار کلمۂ تحسین نکلتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ نواب شمس الدین احمد خاں، داغ کے والد تھے اور کہ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے، کچھ عرصے، لوگوں کو یہ شبہ رہا کہ اس قتل کے پیچھے غالب کا ہاتھ ہے۔ یہ شبہ بے بنیاد تھا۔

مقدمہ پنشن کا عرضی دعویٰ

مصنف نے جب 'ذکرِ غالب' کا چوتھا ایڈیشن ترتیب دیا تو ان کے پیشِ نظر وہ تمام مواد تھا جو غالب کے پنشن کے مقدمے سے متعلق دفتر خانۂ ہند، نئی دلی میں موجود ہے لیکن ان کاغذات میں انہیں غالب کی سب سے پہلی درخواست نہیں ملی تھی جو انھوں نے کلکتے میں گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی۔ بظاہر اس درخواست کے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر جناب مالک رام جہاں تک ممکن ہو ہر کام کو پورا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ چند برس ہوئے وہ لندن گئے۔ وہاں تلاش کرتے پر انہیں انڈیا آفس لائبریری سے وہ گمشدہ

درخواست بھی مل گئی۔ درخواست ظاہر ہے، فارسی ہی میں ہوگی مگر یہ اس کا انگریزی ترجمہ تھا۔

تحقیقی نقطۂ نظر سے اس درخواست کی خاص اہمیت ہے۔ اس سے حیاتِ غالب کی کئی گمشدہ کڑیاں مل گئی ہیں۔ مثلاً

۱۔ درخواست کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے۔ غالب دلّی سے ۱۹ یا ۲۱ فروری (۲۱ جنوری سہوِ کتابت) ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے تھے۔ گویا انہوں نے حالات کا جائزہ لے کر تقریباً سوا دو ماہ بعد درخواست پیش کی۔

۲۔ غالب کی دادی کا انتقال ۱۸۰۶ء اور ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کے درمیان کسی سال ہوا۔

۳۔ غالب کے کئی چھوٹے چھوٹے سفروں کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے دلّی سے باہر کیے۔

۴۔ میرزا یوسف برادرِ غالب ۱۸۲۵ء سے پہلے دیوانے ہو چکے تھے۔

۵۔ غالب جب ان چھوٹے چھوٹے سفروں پر دلّی سے نکلے تو وہ پلٹ کر دلّی نہیں آئے بلکہ وہیں سے پھرتے پھراتے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ انہیں دلّی واپس آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کیونکہ قرض خواہ بُری طرح اُن کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

۶۔ درخواست میں اپنا نام محمد اسد اللہ خان لکھوایا اور اپنے بھائی کا یوسف علی خاں۔

۷۔ غالب نے پہلی بار اس درخواست میں بتایا کہ ان کے دادا کا نام قوقان بیگ خان تھا۔

غرض کہ یہ درخواست تحقیق کے لیے بہت سی نئی راہیں کھولتی ہے۔

ایک معاصرانہ اندراج

یہ آغا جو شرف شاگرد آتش کی ایک مثنوی میں غالب سے متعلق منظوم تذکرہ ہے۔ اس کی

اہمیت صرف یہ ہے کہ" ہمارے پاس غالبؔ کے بارے میں معاصر لکھنوی اہلِ قلم کی تحریریں نہ ہونے کے برابر ہیں ...." اس لیے یہ چند شعر ہی سہی مگر قابلِ لحاظ ہیں۔

(ا)۔ سکّہ کا الزام اور اس کی حقیقت

اور

(ب)۔ غالبؔ سے منسوب دوسرا سکّہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غالبؔ پر سکّے کا جو الزام آیا تھا وہ ہزار کوشش کے باوجود غالبؔ کی زندگی میں دور نہ ہو سکا۔ بالآخر یہ کام جنابِ مالک رام کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ وہ قومی دفترخانۂ ہند، نئی دلی میں کام کر رہے تھے۔ حسنِ اتفاق سے انہیں وہاں صادق الاخبار (دہلی) کا ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (جلد ۴ نمبر ۱) کا شمارہ دستیاب ہو گیا۔ اس کے صفحۂ اول ہی پر وہ سکّہ جو غلط مخبری کی وجہ سے غالبؔ سے منسوب ہو گیا تھا اور جس سے غالبؔ کو بہت نقصان پہنچا تھا، چھپا ہوا مل گیا۔ یہ سکّہ ویرانؔ شاگردِ ذوقؔ کا کہا ہوا ہے۔ اس دریافت کی داد کہاں تک دی جائے۔

دوسرے مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ غالبؔ پر ایک ہی سکّے کا الزام تھا اور جیسا کہ بعض کا خیال ہے، دو سکّوں کا الزام نہ تھا۔

دربارِ رام پور سے تعلق

" دو مضمونوں، غالبؔ سوسائٹی اور (محمّد حسین) آزادؔ بنام غالبؔ، کو چھوڑ کر اس کو فسانۂ غالبؔ کا آخری مضمون کہا جا سکتا ہے یہ اتنا مفصل ہے کہ ۲۹ صفحوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ رام پور سے غالبؔ کا تعلق ۵ فروری ۱۸۵۷ء سے شروع ہوا (جو نواب محمّد یوسف علی خاں کے ایک خط بنام غالبؔ کی تاریخ ہے) اور اپریل ۱۸۶۵ء یعنی نواب محمد یوسف علی خاں کی وفات

تک خوب پروان چڑھا۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں، رام پور کی گدی پر جلوہ افروز ہوئے اور یہیں سے گویا غالبؔ اور ریاست رام پور کے روابط کا زوال شروع ہوا، جو غالبؔ کے انتقال تک جاری رہا۔ نواب کلب علی خاں غالبؔ کے شاگرد نواب یوسف علی خاں کی طرح نہ تھے۔ انھوں نے چند وجوہ کی بنا پر غالبؔ کا سو روپے ماہانہ وظیفہ تو جاری رکھا مگر اور کسی قسم کی مدد نہ کی، بلکہ منہ پھیرے رکھا۔ غالبؔ کے آخری زمانے کے خطوط بنام نواب کلب علی خاں اتنے ملتجیانہ ہیں کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابوالکلام آزادؔ (نقشِ آزاد کتاب منزل ص ۲۹۲) لکھتے ہیں۔

"امرائے ہند کی ناحق شناسیوں اور قدر فراموشیوں کی تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے کہ (غالبؔ کی) اس گدایانہ فریاد کا بھی، جو عہد کے سب سے بڑے باکمالِ فن نے عجز و پیری کے بسترِ مرض سے کی تھی۔ کوئی جواب نہ ملا، اور اسے صرف آٹھ سو روپے کے لیے قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے قبر میں جانا پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اگرچہ اس مضمون کی تیاری میں عرشی صاحب کے مکاتیبِ غالبؔ سے بہت سا استفادہ کیا گیا ہے تاہم مصنف کی اپنی سعی بھی اتنی ہی قابلِ قدر ہے۔

اس مختصر تعارفی مضمون کے بعد آخر میں یہ درخواست کروں گا کہ جو لوگ جنابِ مالک رام کی "ذکرِ غالبؔ" کا مطالعہ فرمائیں وہ اس کے ساتھ "فسانۂ غالبؔ" کا نسخہ بھی ضرور رکھیں۔ 'ذکرِ غالبؔ' کی کئی باتوں کی وضاحت کے لیے 'فسانۂ غالبؔ' حوالے کی ناگزیر کتاب ہے۔

اوّلیاتِ مالک رام

اس وقت میرے پیشِ نظر "سبدِ چین" کا وہ خطّی نسخہ ہے جو نواب صدر یار جنگ[1] نے اپنے کتاب خانے کے مطبوعہ[2] نسخے سے نقل کرواکر اپنے دستخط کے ساتھ جناب مالک رام کو بطورِ تحفہ دیا تھا۔ ایک مدّت بعد یہی نسخہ جنابِ مالک رام نے مجھے میرے غالبؔ کلکشن کے لیے عنایت فرمایا۔ نسخے کے سرورق پر تحریر ہے۔

کتابخانہ حبیب گنج کا تحفہ

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

صدر یار جنگ

۲۲/۳/۳۷

یہ تحفہ جنابِ مالک رام کو کیونکر حاصل ہوا اس کی تفصیل انہیں کی زبانی ملاحظہ

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

[2] "۔۔۔ سبدِ چین ۔۔۔۔ مصنّفہ ۔۔۔۔ غالبؔ، بتاریخ سیزدہم ماہ ربیع الثانی سال یک ہزار دو صد و ہشتاد و چہار ہجری ۔۔۔ در مطبع محمّدی باہتمام محمّد مرزا خان، واقع دہلی ۔۔۔" طبع شد۔

کیجیے[1]:

"ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے غالب کی کتاب 'سبدِ چین' دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ...... (یہ مجموعہ اب) مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض ان تحریروں اور 'یادگارِ غالب' میں اس کا ذکر موجود ہے، اور یہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ...... بعض احباب کی خدمت میں لکھا ...... ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے، نہ ہم نے اسے دیکھا ہے البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ کی خدمت میں لکھ کے پوچھو ...... چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا ..... ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ 'سبدِ چین' کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے .... میں نے ان سے درخواست کی کہ یہ کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے .... اس پر انہوں نے فرمایا ..... میں یہیں سے اس کی نقل لے کر چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انہوں نے یہ نقل مجھے دی ...... (لیکن) انہوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں ..... میں نے جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب[2] بہت محتاط آدمی ہے لیکن ممکن ہے کہ اس سے غلطیاں

---

[1] "وہ صورتیں الٰہی" از مالک رام ص ۷۴-۷۵،

[2] خطی نسخے (نقل مطبوعہ) کے آخر میں یہ عبارت درج ہے "کاتب الحروف محمد سعید خاں تحریر کتب بخانہ حبیب گنج ضلع علی گڑھ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء"

ہوگئی ہوں ...."

اس پر جنابِ مالک رام نے خود علی گڑھ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ ان غلطیوں کو اصل نسخے کی مدد سے دور کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ علی گڑھ گئے۔ آگے ایک لمبی داستان ہے۔ غرض یہ کہ اس طرح غالبؔ کی زندگی میں شائع شدہ 'سبدِ چین' کے پہلے ایڈیشن (۱۸۶۷ء) کے ۷۱ سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۳۸ء) شائع ہوا۔

'سبدِ چین' میں غالبؔ کا وہ فارسی کلام تھا جو کلیات میں چھپنے سے رہ گیا تھا یا اس کے بعد تخلیق ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد کلیات کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے مگر یہ کلام ان میں شامل نہ ہوا۔ مالک رام صاحب نے صرف دوسرا ایڈیشن ہی نہیں چھاپا بلکہ اس میں مرزا کا بہت سا کلام، جو مختلف مقامات پر بکھرا پڑا تھا، بھی یکجا کر کے اس ایڈیشن میں شامل کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ترتیبِ کلام کا نقص بھی رفع کر دیا جس کا خیال پہلے ایڈیشن میں نہیں رکھا گیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب غالبؔ کی زندگی میں ایک بار شائع ہوئی تھی تاہم اب اس حد تک نایاب ہو چکی تھی کہ لوگ اس کے نام سے بھی ناآشنا ہو گئے تھے۔ اس لیے مالک رام صاحب کی یہ تالیف غالبیات میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔

اس وقت جنابِ مالک رام کی عمر صرف ۳۲ برس کی تھی۔ اس کے بعد غالبیات سے جو ان کی دلچسپی بڑھی ہے اور نتیجے میں انہوں نے جو جواہر اگلے ہیں ان کی کچھ تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہاں صرف وہی باتیں گنوائی گئی ہیں جو قطعاً ان کی دریافت ہیں۔

بذر زد سکۂ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

گوری شنکر جو، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، جب دلی پر دیسی سپاہ کا قبضہ تھا اور انگریزی فوج شہر سے باہر پہاڑی پر ڈیرے ڈالے پڑی تھی، انگریزوں کا جاسوس تھا۔ اس کے پرچے میں سچی اور سنی سنائی ہر طرح کی خبریں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس نے ۱۹ جولائی

۱۸۵۷ء کو انگریزی کیمپ میں پرچہ بھیجا اور کہا کہ کل (۱۸؍جولائی ۱۸۵۷ء) کو غالب نے مندرجۂ بالا" سکۂ زر ایک پرچہ پر لکھا۔" غالب پر سکّے کے اس الزام کا وار" ایسا چلا جیسے کوئی چھرّا یا کوئی گراب ...... پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔" اس کا افسوس اس لیے بھی زیادہ ہوا کیونکہ واقعی یہ سکّہ غالب کا کہا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے چاروں طرف خطوں کے گھوڑے دوڑائے، دلّی میں بھی، جہاں ممکن تھا، بات کی مگر معلوم نہ ہو سکا کہ اس سکّے" کا حقیقی مصنّف کون ہے۔ یہ الزام جیتے جی غالب کے دامن سے نہ دھلنا تھا نہ دھلا، حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

آخر کار جنابِ مالک رام کے ہاتھوں، صدی پون صدی بعد، غالب کو سرخروئی حاصل ہوئی۔ وہ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی میں کام کر رہے تھے کہ وہاں انھیں صادق الاخبار (دہلی) کا ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶؍جولائی ۱۸۵۷ء) کا شمارہ دستیاب ہوگیا۔ اس کے صفحۂ اوّل پر یہ عبارت موجود تھی:

سکۂ نو طبع زاد جنابِ حافظ صاحب ویراں شاگردِ رشید استاد ذوق مرحوم

بزر زد سکۂ کشورستانی　　سراج الدین بہادر شاہ ثانی

ظاہر ہے، گوری شنکر کی خبر قطعاً غلط تھی سکّہ ۱۸ جولائی تو کُجا ۶؍جولائی ۱۸۵۷ء سے بھی پہلے کا کہا ہوا تھا۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود حافظ ویراں مصنّفِ سکّہ اور ذوق کے درجنوں دوسرے شاگرد وہاں دلّی میں موجود تھے مگر کسی نے سچ بولنے کی ہمت نہ کی۔

غالبیات میں اضافے کا خبط کچھ ایسی شدّت اختیار کر گیا کہ بعض لوگوں نے جعل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ رسا گیاوی نے ۱۹۴۰ء میں نادر خطوطِ غالب کے نام سے ایک کتاب مرتّب کر کے شائع کی۔ سب سے پہلے جنابِ مالک رام نے

ثابت کیا کہ یہ خطوط جعلی ہیں چنانچہ انھوں نے جامعہ، نئی دلی مارچ ۱۹۴۲ء میں ایک مضمون "نادر خطوطِ غالب پر ایک نظر" لکھ کر اس جعل کا بھانڈا پھوڑا۔ بعد میں (جنوری ۱۹۴۳ء) قاضی عبدالودود مرحوم نے بھی 'معاصر' میں ایک مضمون لکھا۔

قیامِ کلکتہ کے دوران میں جو علمی ادبی معرکہ پیش آیا تھا، اس کے بعد سے غالبؔ کو قتیلؔ اور اس کی فارسی دانی سے اس قدر چڑ ہوگئی تھی کہ وہ وار کرنے کے لیے ہر موقع تیار رہتے تھے (حالانکہ قتیلؔ اس معرکے سے کئی برس پہلے انتقال کر چکے تھے)۔ غالبؔ عمر بھر قتیلؔ کو لالہ دیوالی سنگھ فرید آباد کا کھتری کہہ کر گالیاں دیتے رہے حتیٰ کہ قتیلؔ کے ایک صحیح اندراج کو بھی دانستہ غلط کہہ کر اسے مطعون کیا۔ نہر الفصاحت (نہر الفصاحت) کے اس قول

کدہ بمعنی خانہ باشد یا بنج لفظ ملحق شدہ
سوائے آں مسموع نیست، بتکدہ و غمکدہ و
آتشکدہ و میکدہ و گلشن کدہ ....

کو لے کر غالبؔ نے قتیلؔ کو کیا کچھ نہیں کہا

"یہ شخص (قتیلؔ) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے
پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب
نہیں پاتا۔ بس آزرکدہ اور دیوکدہ اور
نشترکدہ ..... نادرست ہے ....."
(چودھری عبدالغفور کے خط میں۔ مارچ ۱۸۵۹ء)

"وہ (قتیلؔ) کہتا ہے کہ کدہ کے ساتھ سوائے
پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو۔"
(چودھری عبدالغفور کے خط میں۔ مارچ / اپریل ۱۸۵۹ء)

یہ اُلّو کا پٹھا قتیلؔ صفوتکدہ ونشتر کدہ
کو .... غلط کہتا ہے ... ."
(خط بنام ہر گوپال تفتہ - ۲۷ر اگست ۱۸۶۲ء)

غالب نے اس (کدہ) لاحقے کے بیان کو قتیلؔ کی زبان سے نہیں سنا تھا بلکہ قتیلؔ کی تصنیف "نہر الفصاحت" میں لکھا ہوا پڑھا تھا۔ غالب نے متن کی عبارت کو تو بار بار دہرایا ہے مگر قتیلؔ کے حاشیے کو دانستہ نظر انداز کر دیا ہے جو نہر الفصاحت کے اسی صفحے پر درج ہے جس پر متن درج ہے۔ قتیلؔ نے حاشیے میں صاف لکھا ہے کہ یہ صرف اصولاً بیان کیا گیا ہے اس لیے ان پانچ کے علاوہ اساتذہ کے کلام میں جہاں کہیں اس قسم کے مرکبات آئے ہیں وہ اسی اصول کی فروع ہیں۔ حاشیہ پڑھنے کے بعد قتیلؔ کے بیان پر حرف گیری ممکن نہیں۔

آمدم برسرِ مطلب ۔ اِن واقعات کی روشنی میں قتیلؔ کا نام غالب سے کچھ ایسا جڑ گیا ہے کہ قتیلؔ کا حسب نسب دریافت کرنا اور اس کے بارے میں غالب کے بیانات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو گیا۔ حیرت ہے غالب سمیت تمام تذکرہ نویسوں نے قتیلؔ کے صحیح نام و مقام کی نشاندہی نہیں کی بلکہ محقق کو مزید الجھنوں میں پھنسا دیا۔ یہ مالک رام صاحب ہی کی ہمت تھی کہ انہوں نے برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد قتیلؔ کا صحیح شجرۂ نسب، نام اور جائے ولادت کا تعین کیا۔ یہ مضمون اب "فسانۂ غالب" میں شامل ہے۔ قتیلؔ کا پہلا نام دیوانی سنگھ تھا، ذات بھنڈاری کھتری، اصل وطن بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب۔

جوئے کے الزام میں، یہی مشہور تھا کہ وہ صرف ایک بار پکڑے گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب دو دفعہ اس الزام میں گرفتار ہوئے۔ اس کا ذکر

غالب کے اور کسی سوانح نگار نے نہیں کیا تھا۔ مالک رام صاحب نے پہلے مرزا کے ۱۸۴۱ء میں اور پھر ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو پکڑے جانے کی اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ پہلی گرفتاری پر انہوں نے قید کے بجائے جرمانہ بھرا دوسری گرفتاری میں قید بھی ہوئی اور جرمانہ بھی۔ مالک رام صاحب نے اس کا ذکر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی اردو اخبار کی سند پر کیا ہے اس لیے مستند ہے۔

میرزا یوسف برادر غالب کے حالات جو مالک رام صاحب نے بہم پہنچائے ہیں وہ ایک طرح سے اب تک حرفِ اول و آخر ہیں، کلیاتِ نثر غالب، کارنامۂ سروری، اردوئے معلّیٰ، باغِ دو در، خدنگِ غدر، غدر کی صبح و شام، احوالِ غالب، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، مکاتیبِ غالب، دیوانِ معروف تو وہ ماخذ ہیں جو چھپ چکے ہیں اور تھوڑی سی کاوش سے دستیاب ہو سکتے ہیں مگر اس قلمی کتاب (جسے میں نے "تحفۂ غالب" کا نام دیا ہے) اور قومی دفتر خانۂ ہند (NATIONAL ARCHVIES OF INDIA) میں دفن شدہ مسلوں کی ورق گردانی کون کرتا۔ یہ کام جناب مالک رام نے کیا اور اب قارئین کے لیے ایسا مواد پیش کر دیا ہے جس پر اضافہ کرنا اگر نا ممکن نہیں تو آسانی سے ممکن بھی نہیں۔ 'فسانۂ غالب' میں میرزا یوسف کے حالات پڑھیے اور زندہ برادرِ غالب کا نظارہ کیجیے۔

ولیم فریزر مقتول، اور قاتل (اگرچہ براہ راست نہیں) نواب شمس الدین احمد خاں مالک رام صاحب کا مضمون (مشمولۂ فسانۂ غالب) پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اسے ایک ہی نشست میں پڑھے بغیر چارہ نہیں۔ یہ قتل و خون اور سزا و جزا کی ایک داستان ہے جس کی تفصیلات پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ مالک رام صاحب نے دیوانِ معروف، مرقعِ الور، اردوئے معلّیٰ، کلیاتِ نثر غالب، کارنامۂ سروری، واقعاتِ دارالحکومت دہلی، کرنل سلیمان کی مشہور انگریزی

کتاب، تاریخ صحافت اردو، مکاتیب غالب اور سخن الشعراء سے کم کم اور قومی سفارتخانہ ہند کی دفن شدہ فائلوں سے بیش از بیش مواد اکٹھا کر کے مختصراً مگر بھرپور ۴۰ صفحات لکھے ہیں۔ شمس الدین احمد خاں اور قتل فریزر پر شاید اس سے بہتر مضمون نہ لکھا جا سکے۔ نواب شمس الدین احمد خاں، داغ کے والد تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے کچھ عرصے لوگوں کو یہ شبہ رہا کہ نواب کی گرفتاری میں غالب کا ہاتھ بھی ہے مگر یہ شبہ بے بنیاد تھا۔

اپنی پنشن کے سلسلے میں غالب مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے ۱۹ یا ۲۱ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے تھے اور کوئی تین برس کی غیر حاضری کے بعد اتوار ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آئے۔ اسی دوران میں کلکتے میں انہوں نے مقدمۂ پنشن کی پہلی درخواست گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی۔

ذکرِ غالب، کے چوتھے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یوں تو مالک رام صاحب کے پیشِ نظر وہ تمام مواد تھا۔ جو غالب کے پنشن کے مقدمے سے متعلق قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی میں موجود ہے لیکن ان کاغذات میں انہیں یہ سب سے پہلی درخواست نہیں ملی تھی۔ بظاہر اس درخواست کے نہ ملنے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا مگر مالک رام جہاں تک ممکن ہو ہر کام کو پورا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ چند برس بعد وہ لندن گیے، وہاں تلاش پر انہیں انڈیا آفس لائبریری سے وہ گمشدہ درخواست بھی مل گئی۔ درخواست ظاہر ہے، فارسی میں ہوگی۔ یہ اس کا انگریزی ترجمہ تھا۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس درخواست کی خاص اہمیت ہے۔ اس سے حیاتِ غالب کی کئی گمشدہ کڑیاں مل گئیں، مثلاً —

۱۔ درخواست کی تاریخ ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء ہے۔ گویا درود کلکتہ کے تقریباً سوا دو ماہ بعد غالب نے یہ درخواست پیش کی تھی۔

۲۔ غالب کی دادی کا انتقال ۱۸۰۷ء اور ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کے درمیان کسی سال ہوا۔

۳۔ غالب کے چھوٹے چھوٹے سفروں کا پتا چلتا ہے جو انہوں نے دلّی سے باہر کیے۔

۴۔ میرزا یوسف برادرِ غالب ۱۸۲۵ء سے پہلے دیوانے ہو چکے تھے۔

۵۔ غالب جب ان چھوٹے چھوٹے سفروں پر دلّی سے نکلے تو وہ پلٹ کر دلّی نہیں آئے بلکہ وہیں سے پھرتے پھراتے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔ انہیں دلّی آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کیونکہ قرض خواہ بُری طرح ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

۶۔ درخواست میں اپنا نام محمد اسد اللہ خاں لکھوایا اور اپنے بھائی کا یوسف علی خاں۔

۷۔ غالب نے پہلی بار اس درخواست میں بتایا کہ ان کے دادا کا نام قوقان بیگ خان تھا۔

مندرجہ بالا کو مشتے از خروارے کہنا چاہیے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آج سوانحِ غالب پر کوئی کام کرنے بیٹھے تو ہمیں جو کتابیں سب سے مستند، معتبر اور ضروری دکھائی دیتی ہیں وہ لے دے کے یہی 'ذکرِ غالب'، 'فسانۂ غالب' اور 'تلامذۂ غالب' ہیں اور یہ تینوں مالک رام صاحب کی مصنفہ اور مؤلفہ ہیں۔

حیاتِ غالبؔ

ذیل میں چھ ایسی کتابوں کا تعارف منظور ہے جن کا نام "حیاتِ غالبؔ" ہے اور وہ میرے غالبؔ کلکشن میں موجود ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس نام کی اور کتابیں ہیں ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہوں مگر میری نظر سے نہیں گزریں۔

۱۔ حیاتِ غالبؔ از نوابؔ سیّد محمّد مرزا صاحب موّج

سرورق کے چار صفحوں کے علاوہ کل صفحے ۳۲ ہیں۔ سرورق کا پہلا صفحہ یوں ہے:

۷۸۶

"جملہ حقوق محفوظ، جملہ حقوق محفوظ
ماسوا تیرے نہیں رہنے کا کچھ یا باقی
جو ہے فانی ہے تری ذات ہے الّا باقی
(آتشیؔ[۱])"

---

[۱] آتشیؔ غلط ہے آتشؔ چاہیئے۔ یہ مطلع کلیاتِ آتشؔ (مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔ ۱۹۲۹ء) کے ص ۳۱۸ پر موجود ہے۔ غزل کے کل شعر ۲۸ ہیں۔

حیاتِ غالبؔ

یعنی

مختصر سوانحِ عمری مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ مرحوم

مولفہٗ

نواب سید محمد مرزا صاحب متوج مصنف و مؤلف

چاشنیِ الفت۔ گلزارِ محبت۔ ناشاد۔ فریبِ محبت

مکار۔ مجموعۂ نادرہ۔ سوانحِ ناسخؔ۔ سوانحِ آتشؔ،

سوانحِ میرؔ و مترجم تاریخ اعثم کوفی و تحفۃ المومنین،

وغیرہ وغیرہ

بہ سرپرستی ہز ہائینس شہزادۂ والا قدر پرنس مرزا اسلیمان قدر بہادر

نگارستان پریس لکھنؤ میں چھپی

قیمت فی جلد چار آنہ

بقلم سید محمد عباس رضوی الہ آبادی

"

۔۔۔ متن کے پہلے صفحے پر یہ عبارت درج ہے جس سے مولف کی نیک نیتی ظاہر ہوتی ہے اور جو غلطیاں اس کتاب میں راہ پاگئی ہیں ان کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہے۔ عبارت غالبؔ ہی کے مشہور شعر سے شروع ہوتی ہے :

" منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

(غالبؔ)

معززناظرین ! ان چند اوراق کا نہ میں اپنے کو مصنف ٹھہرا سکتا ہوں اور نہ مؤلف۔ جو حالات اس مختصر میں درج ہیں وہ میں

نے ادھر اُدھر سے تراش خراش کر قلبند کر دیے ہیں۔ امیّد ہے
کہ آپ جہاں کہیں سہو یا غلطی پائیں گے دامنِ عفو سے چھپائیں
گے۔

لکھنؤ خادم

بستم اکتوبر ۱۸۹۹ء سیّد محمد مرزا عوج"

— ص ۲ پر شبیہِ غالب ہے۔ یہ معمولی تصرف کے ساتھ اسی تصویر کا دستی چربہ ہے،
جو کلیاتِ غالب، فارسی، مطبوعہ نولکشور۔ ۱۸۷۲ء طبع دوّم میں شامل ہے۔

— ص ۳ سے ص ۲۹ کے نصف تک متن ہے۔ اس کے بعد ص ۲۹ ہی سے شروع ہو کر
ص ۳۲ تک کتب برائے فروخت کی فہرست ہے جس میں صرف "دلچسپ بامذاق
اعلٰی درجہ کے ناول" شامل ہیں۔ سرورق کے آخری صفحہ پر چند علمی، ادبی اور تاریخی
کتابوں کی فہرست ہے جو "مرزا اینڈ سن۔ امین آباد لکھنؤ" سے اس وقت دستیاب
تھیں۔

اس کتاب پر تین مضمون

۱۔ حیاتِ غالب از نادم سیتاپوری ماہِ نو کراچی۔ مارچ ۱۹۶۴ء
۲۔ حیاتِ غالب از غلام رسول مہر " " " ۔ جولائی ۱۹۶۴ء
۳۔ حیاتِ غالب۔ ایک مطالعہ از محمد انصار اللہ اردو ادب علی گڑھ
شمارہ ۱٫۲، ۱۹۶۹ء۔

نکل چکے ہیں جو میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں کتاب کے مختلف پہلوؤں پر کافی
روشنی ڈالی جا چکی ہے میں یہاں صرف وہی باتیں کہوں گا جن سے مجھے امید
ہے کہ کچھ مزید معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

— نادم سیتاپوری صاحب نے 'حیاتِ غالب' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس
کے "زیادہ تر واقعات اور روایات کا مآخذ 'آبِ حیات' ہی معلوم ہوتی ہے"۔

اور جنابِ محمد انصار اللہ نے اس کا مطالعہ ہی "آبِ حیات کی روشنی میں" کیا ہے۔ جو بیشتر صحیح ہے مگر تمام تر صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک اور اہم ماخذ بھی ہے اور وہ ہے نواب سیّد احمد شفیع[1] خاں نیّر فریدآبادی کا مضمون بعنوان "مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ" جو رسالہ مرقّع عالم ہردوئی کے اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ تقابلی مطالعے کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

مضمون مرقّع عالم	حیاتِ غالب
۱۷۹۶ء میں مرزا صاحب پیدا ہوئے۔ ... ایبکی ترک تھے۔ بڑے خاندانی اور شریف بزرگ تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں : ایبکم از جماعۂ اتراک در تمامی زماہ دہ چندیم	ص ۱ مرزا ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے ایبکی ترک اور خاندانی شریف تھے جیسا کہ خود اس فارسی کے شعر میں تحریر کرتے ہیں ؎ ایبکم از جماعۂ اتراک در تمامی زماہ دہ چندیم
	ص ۴ امیر خسرو جس مسند پر بیٹھ کر زمانے کو اپنی نغمہ سنجیوں سے

---

[1] سیّد احمد شفیع نیّر فریدآبادی، نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ والیِ لوہارو و شاگردِ غالبؔ، کی صاحبزادی رضیہ سلطان بیگم کے شوہر۔ شادی ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ ادیب اور شاعر تھے۔ جوانی میں انتقال کیا۔ ولادت ۱۸۶۷ء بمقام فریدآباد، وفات ۱۹۰۶ء ـ بمقام فریدآباد (خاندانِ لوہارو کے شعراء ص ۱۴۲)

دیوانہ بنائے رہتے تھے اور
دنیا کو چھوڑتے وقت کسی
کو اس کے لائق نہ سمجھ کر صندوق
میں بند کر گئے تھے، مرزا نے
اپنے دور میں اس صندوق کا
قفل کھولا اور خندہ پیشانی سے
اس مسندِ مبارک پر قدم رکھا،
اور جھوم جھوم کر کچھ ایسے موثر
لہجے میں نغمہ سرائی کی کہ چاروں
طرف سے آوازِ تحسین آنے لگی۔
مرزا نے اپنے زمانے کے
مستند شاعر عرفی کے قصائد پر
غائر نظر ڈالی اور خود بھی اس
طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ تو ہم نہیں
کہہ سکتے کہ عرفی سے ص ۵ ان
کا پلہ بھاری رہا مگر یہ کہنا بھی
سراسر ناانصافی ہے کہ مرزا عرفی
سے پیچھے رہے۔

(معمولی لفظی ردّ و بدل کے علاوہ تمام
عبارت مضمون مطبوعہ مرقع عالم سے
لی گئی ہے)

ص ۹ میرے (غالب کے) چچا بھی
مرگِ ناگہانی میں مبتلا ہو گئے۔
ان کے مرتے ہی جاگیر وغیرہ ضبط
ہو گئی۔ میں اس زمانے میں بچپن

کی بے خودی سے نکل کر جوانی کے باغ میں پہنچا تھا۔ میرے اُن اعزا نے جو دراصل دولت کو دوست رکھتے تھے، جو جو سلوک میرے ساتھ کیے، نہ میں ان کو بیان کرسکتا ہوں اور نہ آپ سن سکتے ہیں۔	(معمولی لفظی تغیّر کے علاوہ تمام عبارت مضمون مطبوعہ مرقعِ عالم ہی کی ہے)
صرف اس قدر کہ دنیا کافی سمجھتا ہوں ؎ گرد ہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالبؔ رسمِ امیّد ہمانا ز جہاں برخیزد	(مع شعر پورا مضمون مطبوعہ مرقّع عالم کا چربہ ہے)
ص ۲۰ تا ۲۲ پر [ایک لمبی داستان (لطیفہ) بیان کی گئی ہے جو غالبؔ، ان کے ایک نازک مزاج رئیس دوست (جو کوچۂ چیلان میں جو غالبؔ کی جائے سکونت کوچۂ بلیماراں سے قریب ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے) اور غالبؔ کی ایک پالتو بلّی کی مرگ کے اِردگرد گھومتی ہے]	(یہ پوری داستان مضمون مطبوعہ مرقع عالم سے ماخوذ ہے۔)

ا؎ ایک قطعہ جو پہلے پہل کلیاتِ غالبؔ فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ (حاشیہ کا بقیہ اگلے صفحے پر)

سن ۷۹ تہتر برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔	۷۳ برس کی عمر پائی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

۲۔ حیاتِ غالب از نواب سیّد محمّد مرزا موّج (باردوم)

معلوم ہوتا ہے کہ جناب نادم سیتا پوری، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ میں سے کسی کو اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے بارے میں علم نہیں۔ سرورق کا پہلا صفحہ یوں ہے :

ماسوا تیرے نہیں رہنے کا کچھ یا باقی
جو ہے فانی ہے تری ذات ہے الّا باقی
(آتش)

حیاتِ غالب یعنی
مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ مرحوم کی مختصر سوانح عمری
مؤلفہ
نواب سیّد محمّد مرزا موّج مصنف و مولف۔ چاشنی الفت، گلزارِ محبت،

گزشتہ سے پیوستہ: اسی بلّی سے متعلق ہے۔ کل اشعار گیارہ ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے
کز بال پری زادہ بود موج ردم اد

لیکن قطعے کی فکر تک بلّی زندہ تھی۔ بلّی کے مرجانے کا واقعہ مارچ ۱۸۵۲ء اور مئی ۱۸۵۷ء کے مابین کا ہو سکتا ہے جبکہ غالبؔ بلّی ماراں میں حکیم محمد حسن خان کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔

ناشاد۔ فریب محبت۔ سوانح آتش۔ مادو پیانہ وغیرہ وغیرہ
و مترجم تاریخ اعثم کوفی و تحفتہ المومنین وغیرہ
حسب فرمائش، مرزا اینڈ سنس بک سیلرز جنرل مرچنٹس،
پروپرائٹرز۔ بیچین، امین آباد لکھنؤ۔
باہتمام سید حسن باقر مینیجر و منصرم انوری پریس ڈاکخانہ صدر شہر لکھنؤ،
طبع بار دوم انوری پریس لکھنؤ میں چھپی قیمت فی جلد ۱۲؍
متن وہی طبع اول والا ہے۔ صرف سرورق اور آخر کی فہرست کتب بدل دی گئی ہے۔
سال اشاعت درج نہیں لیکن کتاب قدیم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ طبع اول کے چند ہی سال بعد شائع کی گئی ہے۔

۳۔ حیاتِ غالب۔ پبلشر منشی رام اگروال

یہ ۳۰ صفحوں کی کتاب "منشی رام اگروال بک مرچنٹ۔ مہتمم تعلیمی کتب خانہ (پنجاب۔ کذا) پروپرائٹر اردو اخبار و مالک منشی رام اگروال پریس لاہور نے اپنے مطبع منشی رام اگروال لاہور میں" چھاپی تھی۔ سالِ اشاعت درج نہیں مگر اس کے ایک صفحے یعنی ۱۸ سطروں پر مشتمل دیباچے پر تاریخ تحریر اپریل ۱۹۰۵ء درج ہے۔ دیباچہ اطہر ہاپوڑی کا لکھا ہوا ہے اور قیاس ہے کہ وہی کتاب کے مولف بھی ہوں گے۔ دیباچے کی آخری چھ سطریں اس طرح ہیں:

" مرزا غالب کی سوانح عمری جس کا دیباچہ ہم لکھ رہے ہیں اس کے پڑھنے سے گو خاص دلچسپی وہی اصحاب لے سکتے ہیں جو سخن سنجی یا سخن فہمی کے چٹخارے سے لذت آشنا ہیں۔ تاہم عام آدمی بھی بہت سی باتیں سیکھ سکتا ہے۔ مصیبت کے وقت اوسان

درست رکھنا، مستقل مزاجی کو ہاتھ سے نہ دینا، عُسرت میں خوش
رہنا اور شوخیِ طبع کے ساتھ قسمت سے جنگ کرنا۔ صاف دلی،
وضعداری وغیرہ شریفانہ صفات اپنی ذات میں پیدا کرسکتا
ہے ________________________"

کتاب تالیف کرتے وقت مولف کے پیشِ نظر (اگرچہ نام نہیں لیا گیا) "آب حیات" از آزاد اور "حیاتِ غالب" از موج تھیں۔ اس لیے باوجودیکہ طرزِ نگارش موج سے کہیں بہتر ہے اور کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کیے گیے ہیں، کتاب میں وہ تمام غلطیاں در آئی ہیں جو اول الذکر دو کتابوں میں موجود ہیں۔ بلکہ دو ایک غلطیاں اضافہ بھی کردی گئی ہیں جیسے سالِ وفات ۱۲۸۵ھ کے بجائے ۱۲۷۹ھ لکھا ہے۔

'حیاتِ غالب' از موج کی طرح یہ کتاب بھی نہایت غیر مستند ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انتخاب کلامِ غالب میں موج، آزاد پر سبقت لے گیے ہیں۔ اور اظہر ہاپوڑی موج پر۔

۴۔ حیاتِ غالب۔ علم الدین سالک و آقا بیدار بخت

یہ کتاب ۸۰ صفحات اور پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ سرورق دین محمدی پریس لاہور سے چھپا تھا۔ کتاب کا سالِ اشاعت درج نہیں مگر ص ۴۷ پر لکھا ہے کہ خطوط کا ایک "انتخاب بنام نادر خطوط غالب شائع ہوا ہے" اور پھر لکھا ہے کہ "مہیش پرشاد نے رقعات کا ایک بھاری مجموعہ جمع کیا ہے جو وہ کئی جلدوں میں شائع کرنا چاہتے ہیں"۔ نادر خطوطِ غالب ۱۹۳۹ء میں چھپی اور خطوطِ غالب از مہیش پرشاد ۱۹۴۱ء میں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ

کتاب ۱۹۳۹ء کے بعد اور ۱۹۴۱ء سے پہلے (یعنی تقریباً ۱۹۴۰ء میں) شائع ہوئی۔ سالکؔ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور آغا بیدار بخت دار العلوم مشرقی السنہ شرقیہ لاہور کے پرنسپل تھے۔ کتاب کی قیمت ایک روپیہ فی جلد تھی۔ ۱۹۴۰ء تک غالبؔ اور غالبیات پر بنیادی تحقیق ہو چکی تھی۔ اردو دیوان قلمی دریافت ہو کر نسخۂ حمیدیہ کے نام سے چھپ چکا تھا۔ لوگ عام طور پر غالبیات سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ کتاب متذکرہ بالا تمام کتابوں سے زیادہ مستند بلکہ (۱۹۴۰ء تک کی تحقیق کو دھیان میں رکھتے ہوئے) اچھّی سے اچھّی ہے۔

۵۔ حیاتِ غالبؔ از شیخ محمّد اکرام

شیخ محمد اکرام کی مشہور کتاب 'غالبؔ نامہ' پہلے پہل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن اضافے اور تصحیح کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں چھپا۔ اس کے بعد (تقریباً ۱۹۴۴ء میں) انہوں نے اس ضخیم کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کی تفصیل انہیں کے لفظوں میں دیکھیے جو انہوں نے "حیاتِ غالبؔ" کی تمہید میں دی ہے۔

"....ایک.... غالبؔ کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے

حکیم فرزانہ مطبوعہ ۱۹۵۷ء ص۔ ا پر شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں کہ " غالب نامہ کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تین ایڈیشن شائع ہوئے ..... میری نظر سے صرف پہلے دو ایڈیشن گزرے ہیں۔ بقیہ دو ایڈیشن کب شائع ہوئے یہ میرے علم میں نہیں۔ کیا ان کی مراد 'غالب نامہ' کے تین حصّوں میں تقسیم شدہ ایڈیشنوں سے ہے؟ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے ۱۹۵۷ء تک تقسیم شدہ حصّے بھی ایک ایک بار ہی شائع ہوئے تھے۔

تاریخی تربیت سے۔ یہ 'ارمغانِ غالبؔ' کے نام سے ہدیۂ
اربابِ ذوق ہوا تھا۔ دوسری پیشِ نظر کتاب ہے "حیاتِ
غالبؔ"۔ تیسرا حصہ ....۔ اسے 'حکیم فرزانہ' کا نام
دیا گیا ہے۔ تینوں کتابوں کا مجموعی نام 'غالب نامہ' ہے۔"
'ارمغانِ غالبؔ' کے دیباچے میں شیخ صاحب لکھتے ہیں۔
"آج سے کوئی آٹھ سال پہلے ہم نے غالب نامہ ....
مرتب کیا۔ کتاب کی دوسری اشاعت ۱۹۳۹ء میں بعض
اصلاحیں ہوئیں ——————————"

'غالب نامہ' کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اس میں "کوئی آٹھ سال پہلے" کی مدت جمع کرنے سے اواخر ۱۹۴۴ء برآمد ہوتا ہے گویا 'ارمغانِ غالبؔ' جس پر سالِ اشاعت درج نہیں اواخر ۱۹۴۴ء یا اوائل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی ہوگی۔ یہ اس لیے بھی درست ہے کہ اس کے ناشر تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ہیں۔ یعنی تقسیم ملک سے پہلے۔

اب اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ "حیاتِ غالبؔ اواخر ۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۷ء (سالِ اشاعت 'حکیم فرزانہ') کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئی۔ چونکہ اس کے ناشر فیروز سنز لاہور۔ کراچی۔ پشاور ہیں۔ اس لیے قیاس ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان کسی بھی سال چھپی ہوگی۔

شیخ محمد اکرام معتبر ماہرینِ غالبیات میں سے تھے۔ اس لیے کتاب عین ان کے معیار کے مطابق ہے۔ اس میں صرف وہ معلومات نہیں جن کا علم اس زمانے تک نہ تھا۔ بعض باتوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے جو عموماً ایسی معیاری کتابوں میں در آیا کرتی ہیں۔

۶۔ حیاتِ غالبؔ کا ایک باب از ڈاکٹر ملک حسن اختر

یہ کتاب ابھی ۱۹۸۷ء ہی میں مکتبۂ عالیہ لاہور سے چھپی ہے۔ جیسا کہ نام ہے ظاہر ہے یہ غالب کی حیات کا احاطہ نہیں کرتی مگر اس کے بعض پہلوؤں کو روشن کرنے میں مستند کام دے سکتی ہے اور دیتی ہے، خاص طور پر غالب کی پنشن کے بارے میں۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کے پیش لفظ سے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ :

"مرزا غالبؔ کی پنشن کے بارے میں مجھے بعض دستاویزات پنجاب آرکائیوز (پاکستان) میں دستیاب ہوئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ غالبؔ کی پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں اہم مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں نے ان کی روشنی میں حیات غالبؔ پر لکھی ہوئی کتب کا مطالعہ کیا تو ان میں جابجا اصلاح کی گنجائش نظر آئی چنانچہ میں نے ۔۔۔۔۔۔ ایک طویل مضمون قلم بند کرنے کا فیصلہ کیا جو آپ۔۔۔۔آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ دستاویزات۔۔۔۔کے عکس بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔'جاگیر غالبؔ'، دانز پرتھوی چند)۔۔۔۔ کہیں سے نہ مل سکی۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ ہماری جن کاغذات تک رسائی ہوا ان میں سے بعض پرتھوی راج (چند) کو بھی دستیاب نہ ہوسے ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کتاب میں پنشن کے سلسلہ میں مرزا غالبؔ کی بیگم اور ان کی سالی کی درخواست

کے بارے میں ایک سرکاری دستاویز بھی شائع کی جا
رہی ہے ــــــــــــــــــــ‘‘
’’جاگیر غالب‘‘ کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ میں نے مقابلہ کر کے دیکھا ہے کہ اس کتاب میں شائع شدہ کاغذات میں سے کوئی کاغذ ’جاگیر غالب‘ میں شامل نہیں۔

اس کتاب میں جن دستاویزات کی عکسی نقلیں شامل ہیں وہ تعداد میں ۲۷ ہیں اور ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۸ء تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اوّلیں دستاویز کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۶ء (جارج ہلریار لو بارنٹ کا حکم نامہ) ہے اور آخری دستاویز (بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم اور علی بخش خاں کی عرضی کا خلاصہ) ۲۰ فروری ۱۸۳۸ء ہے۔ چار دستاویزوں پر تاریخ درج نہیں ہے۔ بیشتر دستاویزیں انگریزی اور فارسی میں ہیں اور کچھ اردو میں بھی ہیں۔

مصنف کے بعض مشاہدات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے
مثلاً ص ۴۲ پر لکھا ہے۔
’’.... اگرچہ غالب نے اس الزام کو (کہ انھوں نے قتل فریزر میں شمس الدین احمد خاں کے خلاف مخبری کی تھی) غلط قرار دیا ہے مگر عام لوگوں کا خیال یہی تھا اور ہمیں بھی اس میں صداقت نظر آتی ہے ــــــــــــــــــــ‘‘

حیرت ہے کہ آج جبکہ ہر ثبوت منظرِ عام پہ آ چکا ہے پھر بھی غالب کو ملزم ٹھہرایا جا رہا ہے۔ خود غالب نے یہ الزام شمس الدین احمد خاں کے ابن عم فتح اللہ بیگ خان، پر رکھا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف جھوٹی شہادتیں دی تھیں یا مخبریاں کی تھیں، ان کی فہرست ۴ اکتوبر ۱۸۳۵ء کے سلطان الاخبار میں شائع ہوئی تھی ان میں غالب تو کجا، فتح اللہ بیگ

خان کا نام بھی نہیں تھا۔

ص ۴۲، پر درج ہے۔

"۔۔۔ انہوں (غالب) نے دستنبو میں سے عربی الفاظ نکال دیے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ عربی الفاظ نکال کر (۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد) اپنے کٹر مسلمان ہونے سے بچنا چاہتے تھے ــــــــــ"

مصنّف یہاں دُور کی کوڑی لائے ہیں۔ غالب کو عربی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ لکھنے کا ہَوکا تھا۔ یہ حقیقت میں ابوالفضل (آئینِ اکبری) کے تتبّع میں تھا اور بقول عندلیب شادانی (صحیفہ غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۷) یہ "پنج آہنگ کے ہر صفحے سے نمایاں ہے"۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تقریباً بائیس سال پہلے وہ شیفتہ کو لکھتے ہیں" امروز کہ اندوہ درونی، بہ پارسی ناآمیختہ بہ تازی نگاشتہ آمد۔۔۔۔" (آج جبکہ اندوہ درونی کو خالص فارسی، جس میں کوئی لفظ عربی کا نہیں ہے، میں لکھا ہے۔")

غالب کو خالص فارسی میں لکھنے کا شوق جوانی ہی سے تھا جو پوری قوّت سے دستنبو میں ظاہر ہوا۔

کتاب ہر لحاظ سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

غالبؔ کو نام اور پتے کی شہرت کا خیال

۱۵ ارنومبر ۱۸۵۴ء کو ذوقؔ اُستادِ شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس سے غالبؔ کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ظفرؔ اپنے کلام پر غالبؔ سے اصلاح لینے لگے گویا غالبؔ اُستادِ شاہ قرار پائے۔ اسی سال ولی عہدِ سلطنت مرزا غلام فخرالدین رمزؔ بھی ان کے شاگرد ہو گئے اور واجد علی شاہ نے بھی اسی سال ان کا پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ (اگرچہ انتزاعِ سلطنت کی وجہ سے غالبؔ کو یہ مالی منفعت میسّر نہ آسکی)۔ اس طرح غالبؔ کی اَنا کو یک بیک کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، اور انہیں محسوس ہی نہیں، یقین ہوگیا کہ اب ان کی شہرت پورے نام اور تفصیلی پتے کی محتاج نہیں رہی اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اب 'دلّی' اور 'غالبؔ' سے، باہر کے لوگ اس قدر آشنا ہو گئے تھے کہ خطوں پر صرف ان دو لفظوں ہی کا لکھ دینا کافی ہوگیا۔ لیکن غالبؔ کو یہ بھی پسند تھا کہ ان کے نام کے ساتھ خطاب اور تعظیمی لفظ لکھے جائیں۔ ذیل میں چند خطوں کے اقتباس درج کیے جارہے ہیں جو ہمارے کہے ہوئے کی پوری تصدیق کرتے ہیں :

" قبلہ

آپ کو خط کے پہنچنے میں تردّد کیوں ہوتا ہے۔ ہر روز

دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ گاہ گاہ انگریزی بھی، اور ڈاک کے ہرکارے میرا گھر بھی جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلّہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ "لال کنواں" لکھتے رہے اور مجھ کو "بلّی ماروں" میں خط پہنچتا رہا۔ یہ اب کے آپ نے "حکیم کالے" کا نام کیسا لکھا ہے؟ اس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہ ہوا، جو آپ نے بھیجا وہ مجھ کو پہنچا۔ جواب لکھنے میں جو میری طرف سے قصور واقع ہوتا ہے اوس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت مہینا بھر میں نو پتے لکھتے ہیں۔ مَیں کہاں تک یاد رکھا کروں؟ ایک مکان ہو تو اوس کو لکھ رکھوں۔ دوسرا سبب یہ کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں؟ مَیں نے آئینِ نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو۔ کیا لکھوں؟

بنام قاضی عبدالجمیل جنونؔ

۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء

"ملکِ مغرب، بلدۂ دہلی، کٹرہ رودگراں" یہ کیا لکھا کرتے ہو؛ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے:"محلّہ" غلط، "ملک" زائد۔ ہندوستان میں دلّی کو سب جانتے ہیں اور دلّی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں ـــــــــــــــــــــ"

[قبل غدر ۱۸۵۷ء]
بنام غلام حسنین قدر بلگرامی

"دو ایک باتیں اور سمجھا دوں، کہ وہ ضروری ہیں سُنو میری جان۔" نوابی" کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدّولہ"۔ اور اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو" نواب" کہتے ہیں۔ بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جواب ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر" نواب اسداللہ خاں" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے:"نواب" کے لفظ کے ساتھ"مرزا" یا"میر" نہیں لکھتے' یہ خلافِ دستور ہے۔ یا" نواب اسداللہ خاں" لکھو یا مرزا اسداللہ خاں" لکھو۔ اور" بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔ "

بنام منشی شیو نرائن آرام (۱۸۵۸ء؟)

"اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلّے کا نام لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصّہ تمام ــــــــ"

بنام مرزا حاتم علی مہر

۱۸۵۸ء

"اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے "در دہلی بہ اسد اللہ برسد" کافی ہے۔ مگر اب "لال کنواں" نہ لکھا کرو "محلّہ بلّی ماران" لکھا کرو ــــــــ"

بنام میرزا تفتہ

۲ر مارچ ۱۸۵۸ء

"وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں یعنی منشی بھگوان پرشاد، مثل خواں، میرا سلام قبول کریں ــــ"

بنام میرزا تفتہ

۲۸ر جولائی ۱۸۵۸ء

" وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہات جا پڑا، صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلّی میں رہتا ہوں، نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا ___"

بنام میر مہدی حسن مجروح
۸ راگست ۱۸۵۸ء

" صاحبِ مطبع نے خط کے لفافہ پر لکھا ہے :
" مرزا نوشہ صاحب غالب "
اللہ! غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے، ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اوّلِ کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اردو' یا "پنج آہنگ" یا "مہر نیمروز" چھاپے کی یہ کوئی کتاب اوس شہر میں نہیں پہنچی، جو وہ میرا نام لکھ دیتے؟ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا! صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں ہے، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے، مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزراء کے محکمے میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا،

پس اگر صاحبِ مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا کھویا گیا! میری محنت رائیگاں گئی، گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں؟۔۔۔"

بنام میرزا تفتہ
یکم ستمبر ۱۸۵۸ء

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عُرف نہ لکھیں، نام اور تخلص، بس۔ اجزاے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے، مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر" کا اور "بہادر" کے لفظ کے بعد تخلص۔۔۔

اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ "

بنام میرزا تفتہ
۳ر ستمبر ۱۸۵۸ء

"سنو، صاحب، لفظ مبارک 'میم، حا، میم، دال' اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک

حکّام کے ہاں سے یہ لفظ بمعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے، جو چاہو، سو لکھو ـــــ"

بنام میرزا تفتہ
۱۷ر ستمبر ۱۸۵۸ء

" نامور آدمی کے واسطے محلّے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلّے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے ان کی بلا بلی ماروں کا محلّہ کیا چیز ہے ـــــ!"

بنام میرزا تفتہ
۱۹ فروری ۱۸۵۹ء

" اب آپ جو مجھ کو خط بھیجیے، تو رامپور بھیجیے۔ پتا مقام کا کچھ ضرور نہیں، رامپور کا نام اور میرا نام کفایت کرتا ہے ـــــ"

بنام غلام حسنین قدر بلگرامی
۱۸۶۰ء، ص ۱۸۹

"بھائی،
میں نے دلی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا ....
اب جو مجھ کو خط بھیجو، رامپور بھیجنا، سرنامے پر رامپور کا نام اور میرا نام کافی ہے ——"

بنام میرزا تفتہ
۲۱ر جنوری ۱۸۶۰ء

"تم جداگانہ خط کیوں نہ لکھا کرو۔ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ پیڈ، جس طرح چاہا، اپنے آدمی کے ہات ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا آشنا ——"

(از رامپور)
بنام حکیم غلام نجف خاں
۳ر فروری ۱۸۶۰ء

"تمہارا خط پہنچا، تردد عبث، میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے

نہ عرف لکھنے کی حاجت نہ محلے کی حاجت، بے وسواس خط بھیج دیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے"

(از رامپور)

بنام میر مہدی حسین مجروح

فروری ۱۸۶۰ء

"تم جو اپنے فرزند کو ناشناسے مزاجِ روزگار کہتے ہو، خود اس میں اوس سے کیا کم ہو؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہہ الزماں صاحب' کہاں مَیں! اون کا مسکن میرے مسکن سے دُور پھر درِ دولتِ رئیس کہاں اور مَیں کہاں! چار دن والئ شہر نے اپنی کوٹھی میں اوتارا، میں نے مکان جُداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اوس میں رہتا ہوں۔ بہ حسب اتّفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر خط دلی سے چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام، بلکہ درِ دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے"

بنام میرزا تفتہ

۱۸۶۰ء

"سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اوس کی عزّت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور محقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو، مگر جب تک اوس سے قطع نظر نہ کرو اور اوس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔
پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکّام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کے ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانا نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف "دہلی" لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن ــــــــ"

بنام مرزا علاء الدین علائی دہلیتی

۴ اپریل ۱۸۶۱ء

"قبلہ و کعبہ فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ، چہار شنبہ، ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رامپور ہونگا۔ تقریب وہاں جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیس حال کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا اب جو کوئی خط آپ بھیجیں تو رام پور بھیجیں، مکان کا پتا لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے"

بنام مولوی عبدالرّزاق شاکر
اکتوبر ۱۸۶۵ء

"صاحب میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے ——"

بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا
۱۲ مئی ۱۸۶۶ء

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلّی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا

امکان ہے کہ تلف ہو ———————"

بنام حکیم سید احمد حسن صاحب مودودی
۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

جیسا کہ آپ نے مطالعہ فرمایا، خطوں کے یہ اقتباس ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۶ء تک پھیلے ہوئے ہیں یعنی غالب کی شہرت پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔

ناسخ، غالب اور اقبال کا کچھ غیر متداول کلام

ناسخ : غالب کے شاگرد مولانا ابوالفضل محمد عباس شروانی رفعت (۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۶ء تا ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷-۹۸ء) کے والد شیخ احمد عرب یمنی شروانی جن کا انتقال پونا میں ۱۸۴۰ء میں ہوا تھا، صاحب کمال شخص تھے۔ اپنے وقت کے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بہت سی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ یہ واقعہ جس کا مطالعہ ابھی آپ کریں گے، رفعت شروانی کی خود نوشت بیاض (بیاض رفعت قلمی ص ۱۲۲) سے لیا گیا ہے جو میرے کتب خانے کے غالب گلگشن میں شامل ہے۔ تحریر فارسی میں ہے۔ یہاں نثر کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ رفعت لکھتے ہیں :

> "جب ایک روز میرے والد اور شیخ امام بخش ناسخ میں ملاقات ہوئی تو میرے والد نے کہا کہ آپ (ناسخ) کے اردو اشعار تو میں نے بہت سنے ہیں، مگر میں فارسی کلام کا مشتاق ہوں۔ ناسخ نے یہ سن کر فی البدیہہ تاریخ کہی۔

"چوں ملاقی شدم بشیخ احمد
دیدمش معجزی زخلق بنی
سالِ تاریخ صحبتش ناسخ
گفت دل "شیخ احمد عربی"

اس برمحل مادے سے ۱۲۴۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ ملاقات لکھنؤ میں نہیں بلکہ الہ آباد یا کانپور میں ہوئی ہوگی، کیوں کہ ۱۲۴۳ھ سے ناسخ کانپور اور بیشتر الہ آباد میں دن گذار رہے تھے۔ شیخ احمد شروانی بھی غازی الدین حیدر کی وفات (۱۲۴۳ھ) کے بعد لکھنؤ سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور ایک لمبے عرصے تک ایسے ہی شہروں کی سیر و سیاحت کرتے رہتے تھے۔

غالبؔ: اگرچہ غالبؔ کے یہ فارسی قطعے میں اپنی کتاب "متعلقات غالبؔ" میں پیش کر چکا ہوں تاہم اس خیال سے کہ عام قاری کی رسائی اس کتاب تک نہیں ہوئی ہوگی اور کہ اشعار غالبیات میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں، انہیں دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔

غالبؔ ۹ اگست ۱۸۶۶ء کو میر غلام بابا خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کیوں حضرت! صاحبزادے کا اسم تاریخی پسند آگیا یا نہیں؟ نام تاریخی اور پھر سید بھی اور خان بھی، سید مہابت علی خاں۔ عجب ہے اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح نہ میاں داد خاں کے خط میں خبر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی یہی نام رکھیے۔ پسند آئے یا نہ آئے کی تو فقیر کو اطلاع ہو جائے۔"

ظاہر ہے کہ یہ نام (سید مہابت علی خاں) قطعے میں موزوں کر دیا گیا ہو گا مگر خط میں اس قطعے کا کوئی ذکر نہیں۔ تاہم میر غلام بابا خاں نے یہ نام پسند نہیں کیا اور اس نے اپنے بیٹے کا نام میر جعفر علی خاں رکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب نے ان اشعار کو اپنے کلام میں شامل نہیں کیا۔

غالب نے اس موقع پر دو تاریخی قطعے کہے تھے۔ یہ دونوں قطعے ایک ورق پر بخطِ غالب میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ عنوان یہ ہے۔

"من الغالب الی السیف الحق صاحب"

غالب نے میاں داد خاں سیاح کو سیف الحق کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ قطعے غالب نے سیّاح کی وساطت سے میر غلام بابا خان کی خدمت میں گزرانے ہوں گے۔

(۱) ا

نبیرہ نواب باباخاں بہادر
کہ باشد چشم مشتاقِ جمالش
ندیدم گرچہ آں روے دل افروز
ولے شادم بامیدِ وصالش
بود نواب ممدوح آسمانی
ہمیں فرزند فرخ رخ ہلالش
مبارک روشنی شد جلوہ گستر
ازاں گفتیم "فرخ تاب" سالش

۱۲۸۳ھ

(۲)

بتواب بخشید فرزند ایزد
شدم طالب اسم تاریخی آں
بپاسخ چنیں گفت غالبؔ کہ یارب
بماناد سیّد مہابت علی خاں

۱۲۸۳ھ

یہ دونوں قطعے "بیاضِ رفعت" میں بھی موجود ہیں۔ رفعت نے کسی اخبار سے نقل کر کے اپنی بیاض میں داخل کر لیے تھے۔ اشعار وہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ غالبؔ نے "فرخ تاب" والا قطعہ پہلے لکھا اور "سیّد مہابت علی خاں" والا بعد میں، مگر بیاض میں اس کے برعکس ہے۔

اقبالؔ: لکھنؤ کا ایک ادبی سہ ماہی رسالہ "سخن سنج" جنوری ۱۹۱۷ء سے دلگداز پریس میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ اس میں غالبؔ مولانا عبدالحلیم شررؔ کی وساطت سے اقبالؔ کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ میرے کتب خانے میں اس رسالے کی تین جلدیں ہیں۔ یہ اکّا دکّا شعر وہیں سے لیے گئے ہیں۔ رسالے میں جہاں کہیں کوئی شعر کلیاتِ اقبالؔ سے زائد نہیں پایا گیا، وہاں صرف اختلافِ متن بیان کر دیا گیا ہے۔

(۱) سخن سنج (جلد ۱ نمبر ۲) میں دس شعروں کی ایک نظم بعنوان "پیامِ اقبالؔ" شائع ہوئی تھی۔ یہی نظم بانگِ درا میں "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے عنوان سے چھپی۔ مگر اس میں تین شعر بڑھائے گئے ہیں، شاید بعد میں کہہ کر شامل کیے گئے۔ بانگِ درا میں اس نظم کے دو مصرعے اِس طرح چھپے ہیں:

کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا

جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"سخن سنج" میں کردار کی جگہ رفتار اور دیکھیں کی جگہ دیکھو ہے۔

(۲) پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر

یہ غزل سخن سنج (نمبر ۴ جلد ۱) میں چھپی ہے۔ کُل شعر ۷ ہیں مگر بانگِ درا میں ۸ چھپے ہیں۔ چونکہ غزلوں کے سات شعر سے زیادہ منتخب نہ ہوتے تھے اس لیے رسالے کے مرتب نے ایک شعر حذف کر دیا۔ اقبال نے بعد میں تین مصرعوں میں ترمیم کر دی۔ سخن سنج میں اس طرح تھا۔

نفسِ گرم کی تاثیر ہے انعامِ حیات

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

بانگِ درا میں انعام کو اعجاز سے، تا کجا کو کب تلک اور مٹی کو ہستی سے بدل دیا گیا ہے۔

(۳) چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں

بانگِ درا میں اس غزل کے ۸ شعر درج ہیں مگر سخن سنج (جلد ۲ نمبر ۱۶) میں ۶ شعر دیے ہیں۔ تاہم ان میں ایک شعر ایسا ہے جو بانگِ درا میں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت ذیل کا ایک شعر حذف کر دیا گیا اور مزید ۳ شعر

کہہ کر داخلِ غزل کیے گئے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو
ملا وہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

(۴) ؎ نالہ ہے بُلبُلِ شوریدہ ترا خام ابھی
بانگِ درا میں اس مشہور غزل کے دس شعر ہیں مگر سخن سنج (جلد ۲ نمبر ۷) میں صرف ۷ شعر شائع ہوئے ہیں اور ان سات میں ۲ شعر بانگِ درا میں نہیں لیے گئے۔ اس طرح اقبال نے ۵ نئے شعر کہہ کر بانگِ درا میں شامل کیے۔ ۲ حذف شدہ شعر یہ ہیں ؎

جلوۂ گُل کا ہے اک دام نمایاں بُلبُل
اِس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی

ہنوالذّتِ آزادیِ پرواز کجا
بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

(۵) ؎ یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
بانگِ درا میں یہ دس شعر کی نظم دعا کے عنوان سے شامل ہے مگر سخن سنج (نمبر ۹ جلد ۲) میں اس کا عنوان ہے "مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات" اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں۔ حذف شدہ شعر یہ ہے ؎
آتش مَنتشی جس کی کانٹوں کو جلا دے
اِس بادیہ پیما کو وہ آبلہ پا دے

بانگِ درا میں درج پہلے شعر کا مصرع ثانی یوں ہے ؎

جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

سخن سنج میں دوسرے جو کی جگہ اور بروزن فع درج ہے۔ یعنی ... اور روح کو تڑپا دے۔

(۶) ؎ سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں

بانگِ درا میں یہ غزل ۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اگرچہ سخن سنج (نمبر۱۲ جلد۳) میں بھی اشعار کی تعداد اتنی ہی ہے مگر شعروں میں بہت رد و بدل کیا گیا ہے۔ سخن سنج میں مطبوعہ ۲ مصرعے دیکھئے ؎

ہائے کیا اچھا کہا ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا اقبال اپنے آپ کو

بانگِ درا میں پہلے مصرع کے اچھا کہا کو اچھی کہی کر دیا ہے اور ہے کیا کو ہوں آپ بنا دیا ہے۔ ان کے علاوہ تین شعر حذف کر کے تین نئے شعر غزل میں داخل کر دیئے ہیں۔ حذف شدہ شعر دیکھئے ؎

تم نے تاکا دل کو لیکن اف رے شوقِ تیرِ عشق
دِل سے کہتا ہے جگر تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید بھی
پھونک ڈالی اپنی کھیتی، آہ، کیا غافل ہوں میں

میں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل روزِ الست
اب نہ پہچانو تو جانو تم وہی بے دل ہوں میں

(۷) رسالہ خدنگِ نظر مشہور شاعر اور ادیب منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی (۱۸۶۶ء تا ۱۹۲۳ء) کی ادارت میں ستمبر ۱۸۹۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا تھا۔ شاید ۱۹۰۴ء کے اواخر میں بند ہوا ہو گا کیوں کہ مئی ۱۹۰۴ء تک کچھ شمارے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

ستمبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں اقبالؔ کی ایک نظم بعنوان "شیشۂ ساعت کی ریگ" شامل ہے۔ نظم سے پہلے ایڈیٹر کا یہ نوٹ درج ہے۔

اب سے نصف صدی پیشتر تک ہندوستان میں گھر گھر بالو گھڑی کا رواج تھا اور یہی اس زمانے کی آفس کلاک تھی۔ مگر زمانۂ حال کی نمائش پسندیوں نے اب ان چیزوں کو خواب و خیال کر دیا۔ اب لیور جنیوا اور اسکوپ کے سامنے شیشۂ ساعت کو کون پوچھے۔ اس حالت میں ہم مسٹر شیخ محمد اقبالؔ صاحب ایم۔ اے کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے ایک قدیم صنعت کی تاریخی یادگار خدنگ کے صفحوں پر قائم ہو گئی۔ .... ایڈیٹر

اے مُشتِ گردِ میداں، اے ریگِ سرخ صحرا
کِس فتنہ خُو نے تجھ سے دشتِ عَرب چھڑایا
صَرصَر کے دوش پر تو اڑتی پھری ہے صدیوں
بلور کے مکاں میں کرتی ہے اب بسیرا
ہے خارزارِ غربت تیرے لیے یہ شیشہ
قصرِ بلور جس کو میری نظر نے سمجھا
تیرے سکوت میں ہیں سو داستاں پرانی
عہدِ کہن بھی گویا دیکھا ہوا ہے تیرا
اس دن کی یاد اب تک باقی ہے تیرے دل میں
کنعاں کا قافلہ جب سوئے حجاز آیا

دیکھے ہوئے ہیں تیرے فرعون کے سپاہی
تو ہو چکی ہے شاید پامالِ قومِ موسا
چومے تھے تو نے اڑکے مریم کے پائے نازک
لوٹا جو نامرا کی تقدیر کا ستارا
شاید گواہ ہے تو اس روز کے ستم پر
یثرب کا چاند جس دم اپنے وطن سے نکلا
ہو کس طرح بھلا تو اس نقشِ پا سے غافل
جس نے تیرے وطن کو جنّت بنادیا تھا
اے ریگِ سُرخ تیرا ہر ذرّہ کہہ رہا ہے
میں جانتا ہوں قصّہ میدانِ کربلا کا
تو گر دیا ہے شاید بصرے کے حاجیوں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرّہ ہے شناسا
طرزِ نفس شماری شیشے سے تو نے سیکھی
جاسوس بن گئی تو اقلیم زندگی کی

(۸) بانگِ درا میں سات اشعار کی ایک نظم بعنوان "ماہ نو" شامل ہے۔ یہی نظم خدنگ نظر (مئی ۱۹۰۳ء) میں بھی شائع ہوئی تھی مگر اس کے اشعار ۱۷ ہیں۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال نے نہ صرف یہ کہ دس شعر حذف کر دیے بلکہ منتخب اشعار کے ۳ شعروں میں بھی نمایاں ترمیم کر دی۔ پہلے ترمیم شدہ اشعار کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

بانگِ درا : طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
خدنگ نظر : گر رہا ہے طشتِ گردوں میں . . . . .
بانگِ درا : نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

خدنگِ نظر: نعلِ زریں گر پڑی ہے توسن ایام کی

یہ رنگ شفق ہے کہ لہو اہل وفا کا
کچھ داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر میں

بانگ درا: نور کا طالب ہوں اس بستی سے گھبراتا ہوں میں
خدنگ نظر: نور کا جویا ہوں " " " "

اب باقی کے دس اشعار جو خدنگ نظر میں زائد ہیں، پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے نظم پر ایڈیٹر کا نوٹ ملاحظہ کیجئے۔

شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے کی مندرجہ ذیل نظم ہمیں کسی قدر عرصے کے بعد دستیاب ہوئی ہے۔ شیخ صاحب کے فلسفیانہ خیالات سنسکرت کی قدیم شاعری کی طرح بیشتر تشبیہہ و استعارات میں ادا ہوتے ہیں۔ ذیل کی نظم میں بھی وہی رنگ نمایاں ہے) (کذا۔ قوسین میں الفاظ میرے ہیں) بلکہ اس میں معمول سے بہت زیادہ نئی نئی تشبیہیں موجود ہیں۔ — ایڈیٹر

شام نے آکر پڑھا دیباچۂ مضمونِ شب
ہے لبِ پیرِ فلک پر مصرعِ موزونِ شب
منشیِ قدرت مگر کھا کر کہیں ٹھوکر گرا
جب سیاہی گر چکی قط زن سیاہی پر گرا
کاسۂ سیمیں لیے ہاتھوں میں آیا دیکھنا
آسماں دریوزۂ ظلمت کو نکلا دیکھنا

دام بانی کر رہی ہے زلفِ مشکینِ شام کی
نیل کے پانی میں اِک مچھلی ہے سیم خام[12] کی

اے چراغِ دودمانِ آفتابِ خاوری
قہر ہے چشمِ تصور پر تری جادوگری

تو وہ رہ رو ہے کہ پھرتا ہی رہا منزل کے گرد
قیس کی صورت جبیں سا ہی رہا محمل کے گرد

سرمۂ گوہر مری آنکھوں کو تیری دید ہے
اے مہِ نو تو ہلالِ مطلعِ امید ہے

آرزوئے نو ایں ہے صورتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

چاہیئے میری نگاہوں کو انوکھی چاندنی
لا کہیں سے ماہِ کامل بن کے ایسی چاندنی

ظلمتِ بیگانگی میرے وطن سے دور ہو
خاکِ ہندوستان کا ہر ذرّہ سراپا طور ہو

---

[12] اقبالؔ نے شعر حذف کر کے یہ مصرع بانگِ درا کے ایک شعر میں کھپا لیا ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ مشرقی افریقہ میں

غالبؔ اور اقبالؔ دو ایسے نام ہیں جو اُردو زبان کو اس کی کم عمری کے باوجود اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی زبانوں کے برابر لاکھڑا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں اُردو کے شائقین گئے وہاں وہاں اُنہوں نے غالبؔ اور اقبالؔ کو اونچے سے اونچا ادبی مقام دیا۔ مشرقی افریقہ کے اُردو والوں نے بھی اُن کو برابر یاد رکھا۔ ذیل میں پہلے غالبؔ اور پھر اقبالؔ سے متعلق چند ایسی تحریروں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو مشرقی افریقہ کے شاعروں اور ادیبوں نے وقتاً فوقتاً رسالوں، مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبوں میں پیش کیں۔

غالبؔ

سبدِ گل نمبر ۲ ص ۱۷ (مطبوعہ ۱۹۳۸ء) پر مقدّمے میں درج ہے:

" دوسرے مشاعرلے میں بزم کا موضوعِ بحث

لے ان مشاعروں میں مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔

غالبؔ تھا۔ چنانچہ اس ایشیا کے امام الشعراء
کی نہ صرف زندگی بلکہ اس کے کلام کے مختلف
پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی جس کا خاکہ
اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔"

اس خاکے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاعرے میں طرحی اشعار کے علاوہ ایک نظم اور دو مقالے غالبؔ پر پڑھے گئے۔ حاجی اسلم چشتی نے غالبؔ پر مقالہ پڑھا، سجّاد حسین شمسی نے غالبؔ کے کلام پر تبصرہ کیا، اور ہدایت اللہ شیدا نے ایک "بسیط نظم" سنائی جس کا مقطع تھا۔

ہزار ہو کوئی شہ زورِ شاعری شیدا
اسدؔ سے شیرِ سخن کو گرا نہیں سکتا

مختصر تفاصیل بتاتی ہیں کہ مشرقی افریقہ کے مقالہ نگاروں کو غالبؔ کی حیات و شاعری سے کم از کم اُس وقت کے عام ہندوستانی اُردو داں جیسی واقفیت حاصل تھی۔

ماہنامہ 'الادب'[1] کے تیسرے شمارے (جون ۱۹۴۵ء) میں ایک مضمون باسط مسقطی کا "غالبؔ کی صحبتیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ مسقطی کینیا کے ایک شہر نکورو میں رہتے تھے۔ اس مضمون میں مسقطی صاحب نے سید غوث علی شاہ قلندر اور غالبؔ کی صحبتوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔
۱۹۶۸ء کے آخر میں ایس۔ اے مہدی (علیگ) نے ایک ۱۴ صفحہ

---

[1] مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی سے شائع ہوتا تھا۔

کی کتاب 'بزمِ غالبؔ' کے نام سے چھاپی۔ مہدی صاحب ممباسہ (کینیا) کے اثنا عشریوں کے ایک اسکول کے پرنسپل تھے۔ شاید فرخ آباد کے رہنے والے تھے اور واقف فرخ آبادی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ یہ کتاب "صد سالہ جشنِ غالبؔ" کے سلسلے میں مشرقی افریقہ سے غالبؔ کے ایک پرستار کا ہدیۂ عقیدت ہے۔ اس میں دیباچے کے علاوہ ایک نظم بعنوان "غالبؔ" ہے۔ 'تضمین' کے عنوان کے تحت غالبؔ کی پانچ مشہور غزلوں کے ہر شعر پر تین تین مصرعے لگائے ہیں آخر میں 'رنگِ غالبؔ' میں تیس صفحے غزلوں کے ہیں جو انھوں نے غالبؔ کے رنگ میں کہی ہیں۔ ایک تضمین کے دو بند دیکھیے ؎

کیا چیز ہے یہ گلشن و صحرا مرے آگے
اک کھیل ہے یہ ساحلِ دریا مرے آگے
سب آئے مگر کوئی نہ ٹھہرا مرے آگے
"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

فکر و غم و اندوہ کا دل میں تھا بسیرا
ہر چند اسے گردشِ ایام نے گھیرا
مہدیؔ نے کسی غم سے مگر منہ تو نہ پھیرا
"ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا

غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے"

ایک غزل بھی سن لیجیے جو انہوں نے غالبؔ کے رنگ میں کہی ہے ؎

دِل کی یاد آئی جگر یاد آیا
جب تیرا تیرِ نظر یاد آیا
دِل میں تھا محفلِ عشرت کا سماں
یک بہ یک رقصِ شرر یاد آیا
ان کے چہرے پہ نظر کی جس دَم
پھول یاد آئے قمر یاد آیا
روئے گُل آئینہ بردار ہوا
تو بہ اندازِ دِگر یاد آیا
ایک ہی رات کا مہماں تھا شباب
ہم کو ہنگامِ سحر یاد آیا

۱۹۶۹ء میں غالبؔ کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں ایک تقریب میرے غریب خانہ پر بھی منعقد ہوئی تھی چونکہ اس کی رپورٹ ماہنامہ صبحِ امید بمبئی (جولائی ۱۹۶۹ء ص ۱۶ تا ۱۸) میں شائع ہوئی تھی اس لئے محفوظ رہ گئی، اور اب جستہ جستہ یہاں درج کی جاتی ہے۔

" ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو احباب نے نیروبی میں غالبؔ کی صد سالہ برسی منانے اور غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ محفل جناب کالی داس گپتا رضاؔ کے دولت خانے پر منعقد ہوئی۔ مشاعرے کی

صدارت کینیا ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس
چانن سنگھ نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام
دی نشست مخصوص تھی اور صرف چالیس سے
کچھ اوپر افراد پر مشتمل تھی۔ رضا صاحب کے
ہاں محفلیں بارونق، شائستہ اور پُرلطف ہوتی
ہیں۔ رات کے ۸ بجے سے شعراء اور سامعین آنے
شروع ہو گئے تھے اور ٹھیک وقت یعنی ۹ بجے
تک تمام لوگ آ چکے تھے۔ ایک زمانے میں
یہاں اردو شعراء کی بڑی تعداد تھی مگر اب
نو، دس ہی رہ گئی ہے۔ آزادی کے بعد نئے
قوانین کے نافذ ہونے سے لوگ ایک ایک کر کے
اپنے وطن واپس جا رہے ہیں، مشاعرے کے دو
دَور ہوئے۔ پہلا طرحی اور دوسرا غیر طرحی۔ پہلا
دور ۹ بجے شروع ہوا اور ۱۰½ بجے ختم ہوا۔ آدھے
گھنٹے تک انٹرول رہا جس میں رضا صاحب نے
شعراء اور سامعین کی چائے اور کیک وغیرہ سے
تواضع کی۔ ۱۱ بجے دوسرا دور شروع ہوا۔ جو
۱۲½ بجے تک جاری رہا...........،،

اس کے بعد رپورٹ میں قطعات وغیرہ اور طرحی غزلوں کے اشعار درج ہیں مگر یہاں صرف وہی اشعار دیے جاتے ہیں۔ جو غالب سے متعلق ہیں ؎

کالی داس گپتا رضاؔ :

اشعارِ نَو کا روح و قالب غالبؔ
ہر طور نئی بات کا طالب غالبؔ
شاعر تھا ضرور وہ نرالا ۔ ورنہ
یوں ہوتی نہ شہر شہر غالبؔ غالبؔ

بالا ہے بلند ہے مقامِ غالبؔ
مشہور ہے آفاق میں نامِ غالبؔ
پوچھا کہ ہے اس وقار کا کیا باعث
آواز یہ آئی کہ " کلامِ غالبؔ "

محمد لطیف[1] لطیفؔ :

پُر کیف اثر خیز، خردمند، مدبّر
غالبؔ سے سخن سنج کا مذکور ہے گھر گھر
برسی پہ لطیفؔ اس کی میں اتنا ہی کہوں گا
سَو سال میں پیدا نہ ہوا ایسا سخنور

---

[1] آج کل اسلام آباد پاکستان میں مقیم ہیں ۔

ساحرؔ شیوی :

غالبؔ نکتہ داں اے امامِ غزل
کھل اٹھے تیری یادوں کے دل میں کنول
شعرِ اُردو میں تو ہی ہے یکتائے فن
نام تیرا ہی ہونٹوں پہ ہے آج کل
اس قدر خوبصورت ترے شعر ہیں
چاند تارے بھی ان کا نہیں ہیں بدل

علی جمالؔ[1] :

نوشاہِ سخن خسروِ شیریں دہناں
تسکین دہِ دیدہ و قلبِ انساں
کم کر نہ سکا رونقِ صد سالہ جشن
نے مہرہ سیاست کا نہ زورِ دوراں

محمدؐ عاشقؔ[2] عاشقؔ :

فہم و تقدیر ہے غالبؔ کی غزل
عقل و تدبیر ہے غالبؔ کی غزل
ہم نے ہر ڈھنگ سے دیکھا اس کو
دل کی تصویر ہے غالبؔ کی غزل

---

[1] آج کل انگلینڈ میں ہیں۔

[2] چند برس ہوئے لاہور (پاکستان) منتقل ہو کر انتقال کیا۔

شکتی[1] پرشاد شارو :

غالبؔ تری عظمت تو ہمیشہ ہی رہے گی
اور ہوتی رہے گی ترا دیوان ہے جب تک
سو سال پرانا ہے مگر پھر بھی نیا ہے
ہر فکر ترا عرش تک آباد ہے اب تک

ظفر اللہ خان عاصیؔ :

شاعری کا تُو بدن ہے شاعری کی جان ہے
ہند و پاکستان میں اردو کی تجھ سے شان ہے
روح غالبؔ تُو نے یکسر شاعری میں پھونک دی
شاعری پر تیرا اے غالبؔ بڑا احسان ہے

چمن[2] لال چمنؔ :

رندانہ طبیعت تری شاہانہ ترے طور
ہر شعر نشہ آور ہر فکر میں اک دور
تھے اور بھی دنیا میں ہزاروں ترے ساتھی
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا تھا اندازِ بیاں اور

---

[1] انگلینڈ میں جا بسے تھے وہیں انتقال کیا۔

[2] آج کل انگلینڈ میں ہیں

وجے کمار اروَن :

خوب و خوشتر ہے کلامِ غالبؔ
مے کا ساغر ہے کلامِ غالبؔ
اب بھٹک سکتا نہیں دل اپنا
دِل کا رہبر ہے کلامِ غالبؔ

صلاح الدین عاکفؔ :

جس طرح سے پڑھ کر بھی اسے تم دیکھو
پھیکا نہیں ہوتا ہے سخن غالبؔ کا
ہر رنگ کے گل بوٹے ملیں گے اس میں
کیا خوب مہکتا ہے چمن غالبؔ کا

بال کرشن شرما :

"خان زمان" ہیں غمزدہ رنج میں "آسانند" ہیں
ہم بھی ہیں سوچ میں بہت آپ بھی فکرمند ہیں
کاش وہ اٹھ کے خواب سے بزمِ رضا میں آسکے
غالبِ خستہ کے بغیر سارے ہی کام بند ہیں

اقبالؔ

مشرقی افریقہ میں تقریباتِ یومِ اقبالؔ علامہ کی زندگی ہی میں شروع

لے پاکستان کو مراجعت کر گئے تھے ۔ اب حال معلوم نہیں ۔

ہو گئی تھیں، اس کے تحریری آثار سب سے پہلے ماہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ملتے ہیں جب کہ مشرقی افریقہ کے شاعروں کی غزلوں کا گلدستہ "سبدِ گل نمبر ۱" مرتب ہوا اور "بسلسلہ یومِ اقبال" شائع ہوا۔ مشاعرہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء کو منعقد ہوا تھا اور طرحی غزلوں سے پہلے اقبال کی زندگی اور اُن کے کلام پر تبصرہ کیا گیا تھا۔

" محترم جناب چانن سنگھ صاحب شفق نے حضرت علامہ کے سوانحِ حیات بیان فرمائے، محترم سعید مرزا صاحب نے اقبال اور ان کا فلسفہ' کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ صاحب صدر نے "اقبال اور مذہبیات" کے موضوع پر تقریر فرمائی جناب بدرالدین صاحب بیدل نے شعر اور اس کا بنی نوع انسان سے تعلق، پر تقریر فرمائی یقریریں مجموعی طور پر پسند کی گئیں" [۱]

"سبدِ گل نمبر ۲". جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں 'بزمِ ادب' کی طرف سے کیے گئے مشاعروں کی رُوداد شامل ہے۔ ان مشاعروں میں مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔ مقدمے (ص ۱۷) میں لکھا ہے:

" بزم کے زیرِ اہتمام پہلی بحث کا موضوع 'اقبال' تھا۔ چنانچہ دنیائے ایشیا کے سرمایہ ناز فلسفی گردوں رفعت شاعر اور عرش گیر مفکر کی زندگی، اس کا کلام اور اس کی فکر کوئی معمولی حیثیت نہیں

---

[۱] سبدِ گل نمبر ۱ ص ۲۔

رکھتے ...."
اسی کتاب میں جان سنگھ شفق کا ایک مقالہ 'علامہ اقبال' شامل ہے جو ص ۳۱ سے ص ۴۱ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اس تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا تھا جو علامہ کے انتقال کے فوراً بعد منعقد کیا گیا تھا۔ اسی میں ایک رپورتاژ بھی شامل ہے۔ آخری چند سطور دیکھیے :

" کینیا کالونی کے دارالحکومت نیروبی میں مختلف اداروں کی جانب سے برقی پیغامات تعزیت ارسال کیے گئے اور بزم ادب، نیروبی کے زیر اہتمام یہ عظیم الشان اجلاس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے ..."

رپورتاژ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

" آخر میں اس اجلاس میں ماتمی قرار دادیں متفقہ طور پر پاس ہو کر مرحوم کے فرزند ارجمند جاوید اقبال کے نام ارسال کی گئیں ۔

حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا"

ماہنامہ " الادب " نیروبی جس کا اجراء اپریل ۱۹۴۵ء میں ہوا تھا بھی اقبال کی دوامی عظمت کو تسلیم کرنے میں پیچھے نہیں رہا چنانچہ مئی ۱۹۴۵ء کے شمارے کو اقبال نمبر کا نام دیا گیا۔ اس نمبر میں تقریباً تمام تخلیقات نظم و نثر اقبال سے متعلق ہیں جن میں بیشتر وہ ہیں جو ہندوستان سے حاصل کی گئی تھیں۔ پانچ مضامین مشرقی افریقہ کے ہندوستانیوں کے طبع زاد ہیں۔ "اقبال کے نظریات" از عرشی صاحب[1]

---

[1] میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

میاسہ، اقبالؔ کا ایک شعر، از قاری نصیر احمد[1]، ترجمانِ حقیقت؛ از منظور حیدر[2] ماں کا خواب' از محسن[3]، اقبالؔ کے مختصر سوانح حیات، از اے۔ کے محمد[4]۔ چونکہ ان مقامی ادیبوں میں محسن صاحب اور قاری نصیر احمد صاحب کے مضمونوں میں ندرت ہے اس لیے صرف انہیں میں سے ایک ایک مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ محسن صاحب نے نظم" ماں کا خواب[5]" کے آخری شعر ے

سمجھتی ہے تُو ہو گیا کیا اسے ؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

کو سامنے رکھ کر تین صفحات کا مضمون لکھا ہے۔ لب لباب یہ ہے :

" عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی گھر میں کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو عورتیں حد سے بڑھ کر واویلا کرتی ہیں .... باہر سے مستورات اکٹھی ہو ہو کر تشریف لاتی ہیں اور .... ماتم اور رونا پیٹنا ہوتا رہتا ہے .... (غم سہنے کا) احسن طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے سینے پر صبر کا کڑا پتھر رکھیں کہ صبر

---

[1] ایڈیٹر" الادب" سعید مرزا کے والد محترم۔

[2] کالٹیکس میں افسر تھے آج کل کراچی میں ہیں۔

[3] پورا نام محسن علی شاہ ہے۔ ایس۔ ایم علی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

[4] حال معلوم نہیں۔

[5] یہ ایک انگریزی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔

ہی سے زندگی کے اعلیٰ مدارج پر عبور ہو سکتا ہے
ورنہ .... بقول غالبؔ مرحوم قید و حیاتِ بند
غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی
غم سے نجات پائے کیوں ....“

” اقبالؔ کا ایک شعر“ کے عنوان سے قاری نصیر احمد مرحوم نے اقبالؔ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ کسی ہندوستانی اخبار یا رسالے کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے:

” اقبالؔ مرحوم کا نیاز حاصل کرنے کی ضرورت
بچپن میں مجھے اس وقت ہوئی۔ جب آپ امرتسر
ندوۃ العلماء کانفرنس میں یا علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس میں نہ صرف بغرض شمولیت ہی تشریف
لائے بلکہ آپ کو اپنی نظم بھی پڑھنا تھی شیخ عبدالقادر
صاحب جو اس وقت آبزرور کے ایڈیٹر تھے،
اب ماشاء اللہ خان بہادر سر شیخ عبدالقادر اور
ہائی کورٹ کے جج ہیں اور ایک قاضی صاحب
جن کا اسم گرامی بھول گیا ہوں چیفس کالج کے
عربی پروفیسر تھے۔ یہ تینوں حضرات میرے بڑے
بھائی قاری رشید احمد مرحوم کے مہمان تھے۔ میں
اگرچہ سنِ بلوغت کو نہ پہنچا تھا تاہم میرا تعارف
ان معزز مہمانوں کے ساتھ کرایا گیا۔ میں ان کی
مجلس میں بیٹھ گیا۔ مجھے وہ زرین الفاظ آج بھی
اچھی طرح یاد ہیں جو اقبالؔ مرحوم نے پبلک کی

اشعار فہمی کے متعلق فرمائے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا:

"شاعر تو اپنا لہو اور پسینہ قوم کو متحرک کرنے میں ایک
کر دیتا ہے مگر واہ ری پبلک وہ شعر سنتے جاتے
ہیں اور واہ واہ، سبحان اللہ مرحبا کے غلغلے بلند
کرتے جاتے ہیں۔ نظم ختم ہوئی اور انھوں نے زور
سے تالیاں بجائیں، کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے
اور گھروں کو چل دیے..... اگر ان اشعار کو لوگ
اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں تو قوم جو سَو سال میں تیار ہوتی
ہے چند سالوں میں کہیں کی کہیں پہنچ جائے۔"

مشرقی افریقہ میں میرے لئے پہلا یوم اقبال اپریل ۱۹۵۰ء میں آیا۔ مجھے نیروبی پہنچے ابھی سال بھر کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ حلقہ گفتوش[۱] کی طرف سے یوم اقبال منایا گیا۔ اب میں اس کی پوری رُوداد بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر ایک کاغذ سے جو فائل میں لگا ہوا ہے یہ ظاہر ہے کہ یہ تقریب ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء کو منائی گئی تھی میں نے یہ نظم سنائی تھی ؎

زندگی کی اونچی نیچی راہ پر چلتے ہوئے
حرف کی باریکیوں میں شمع ساں ڈھلتے ہوئے
شاعری کی تنگیوں کو وسعتیں دیتے ہوئے
کشتیِ علم و ادب طوفاں میں بھی کھیتے ہوئے

---

[۱] گفتوش دراصل گفت و نوش کا مخفف ہے۔ دفاتر سر علی مسلم کلب نیروبی کی عمارت میں تھے۔ صرف مسلمان (بیشتر پنجابی) اس کے ممبر ہو سکتے تھے چونکہ اس کی تقریبات میں تقاریر اور شعر خوانی کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا بندوبست بھی رہتا تھا اسلئے اسے حلقہ گفتوش کا نام دیا گیا اس حلقے کے بیشتر اراکین میرے دوست تھے۔

شبیر کا سا حوصلہ لے کر فضا میں دھاڑ کر
پردۂ وہم و گماں کو تیغ دل سے پھاڑ کر
رازِ انساں کو زبانِ بے خودی سے کھول کر
جوہرِ پنہاں کو چن کر موتیوں میں تول کر
اس طرح آگے بڑھا وہ بحرِ پُر گرداب میں
ناؤ تک سے واسطہ رکھا نہ زورِ آب میں
یہ جو اپنی قوم کا ہر دم شریکِ حال تھا
شاعرِ ملت سراپا شعر سر اقبال تھا
آج اس کے رنج میں ہر مرد و زن ہے نغمہ خواں
پھول برساتی ہے اس کی قبر پر اُردو زباں
اس نے چند اوراق ہی میں ایک دفتر رکھ دیا
مٹ نہیں سکتی ہے شان و ندرت "بانگِ درا"
بالِ جبریل، اور ضربِ کلیم انسان پڑھے
ہر قدم پر زندگی سو منزلیں آگے بڑھے
کون ہو سکتا ہے اس کے شعر کا ثانی وہاں
روح کی سب گتھیاں ہی کھول ڈالی ہوں جہاں
اس کے نغمے حشر تک گونجیں گے ہفت اقلیم میں
اے رضا جھکتا ہے سر اقبال کی تعظیم میں

سر علی مسلم کلب ہال میں ۲۳ اپریل ۱۹۵۳ء کو پھر یوم اقبال منایا گیا۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی جس میں ہندوستان کے ہائی کمشنر اور پاکستان کے ہائی کمشنر نواب صدیق علی خاں پہلی بار ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سننے والوں کی ایک بڑی تعداد اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ہال کے باہر ہمہ تن گوش

تھی۔ لاؤڈ اسپیکروں کا بہت اچھا انتظام تھا۔ اسٹیج پر بجلی اور نشستوں کی ترتیب بھی نہایت باسلیقہ تھی۔ اچھی سے اچھی تقریریں سننے میں آئیں۔ مقررین نے اقبال کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا۔ نظم پڑھنے والوں میں صرف میں ہی تھا۔ میں نے ایک قطعہ، دو رباعیاں اور ایک نظم پیش کی۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

قطعہ

ذہن ناکارہ کو پھر ذوق ہمہ دانی دے
طبع حاضر دے سے خیالوں کی فراوانی دے
یہ تدابیر، یہ ماحول، یہ مسند، یہ ہجوم
میرے مولا مجھے توفیق ثنا خوانی دے

رُباعیاں

ہشیار ہے بیدار ہے بزم اقبال
خوش رنگ و ضیا بار ہے بزم اقبال
یہ کھلتے ہوئے چہرے یہ ہنستی محفل
اِک عالمِ انوار ہے بزمِ اقبال

اس بزم کا کیا رنگ خود آرائی ہے
ہر قلب کسی شے کا تمنائی ہے
اور منتظر آنکھوں کے حسیں پردوں پر
اقبال کی تصویر اتر آئی ہے

نظم

یہ کیا ماجرا ہے یہ کیا واقعہ ہے، یہ کیا دل لگی ہے یہ کیا دلبری ہے
سمٹ کر ادب دوستوں کی یہ دنیا، جو اس تنگ سے ہال میں آ گئی ہے
یہ وہ لوگ ہیں جن کی علم و ادب سے، وفا مستقل ہے جفا عارضی ہے
یہ اقبال کی مدح مجھ سے سنیں گے کہ میرے بھی حصے میں کچھ شاعری ہے
صفت میں سر اقبال کی میں کہوں کیا کہ اقبال کی شاعری ہی نئی ہے
نئی خلوتیں ہیں نئی جلوتیں ہیں، نیا غلغلہ ہے نئی خامشی ہے
کچھ ایسا اثر رکھ دیا ہے سخن میں، وہ جوش نمو بھر دیا ہے چمن میں
کہ ڈالی سے ٹوٹے ہوئے پھول میں بھی وہی پہلی سی تازگی آ گئی ہے
کہیں بے خودی میں خودی کو دکھایا کہیں تہ نشیں کو فلک پر بٹھایا
کہیں ہے نصیحت کہیں فلسفہ ہے، کہیں مرد کامل سے دل بستگی ہے
تصوف کا مشرب محبت کی رسمیں خدائی کی شان اور ہستی کی شوکت
بتایا یہ اقبال نے ہم کو آ کر انہیں کی خبر حاصل زندگی ہے
حکومت امارت، زر و مال و حشمت نہیں مرد مومن کی نظروں میں کچھ بھی
یہ عقل و تدبر کی محدود طاقت، فقط اہل دنیا کی دیوانگی ہے
یقین و عمل پر اگر ہو بھروسا تو یہ دست و بازو نہیں نرم و نازک
انہیں سے لڑائی میں فاتح ہے انساں انہیں سے یہ ظاہر کی دنیا بنی ہے
اگر اپنی ہستی کو پہچان لیں ہم رموز خودی کو اگر جان لیں ہم
تو محسوس کر لیں گے ہم دم زدن میں کہ دنیائے غم بھی سراپا خوشی ہے
رضا یہ ہماری طبیعت نے مانا نگاہوں نے دیکھا ذہانت نے جانا
کہ اقبال کی مشعل شاعری میں نئی روشنی ہے نئی زندگی ہے

اسی زمانے میں پاکستان ہائی کمشن کی طرف سے اعلان ہوا کہ پیغامِ اقبال پر بہترین مضمون لکھنے والے کو انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ میں بھی ایک مضمون لکھ کر اس مقابلے میں شامل ہو گیا۔ اس کی ایک کاپی میرے ریکارڈ میں موجود ہے۔ مضمون کے لیے پندرہ سو لفظوں کی قید تھی۔ میں نے اپنا یہ مضمون ۱۲/اپریل ۱۹۵۳ء کو لکھ کر پیش کیا تھا۔ مضمون کی آخری چند سطریں یہ ہیں :

"نفسِ مضمون کے لحاظ سے مضمون کوئی زیادہ
طویل نہیں ہوا مگر پندرہ سو لفظوں کی قید مجبور کرتی
ہے کہ میں صرف دو طبع زاد شعر کہہ کر رخصت لوں ۔

"اے اپنی نظر میں فرزانو! اے ذوقِ عمل سے بیگانو
اقبال کے مالِ ہدایت سے تم اپنے دامن کو بھر لو
وہ اپنے جوشِ سخاوت میں ہر راہ میں موتی لٹاتا ہے
پیغام اس کا محدود نہیں، اقبال کو لامحدود کرو"

خوش قسمتی سے میرے مضمون کو بہترین انعام کا حق دار تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ ۱۱/جنوری ۱۹۵۴ء کو محترمہ خورشید آراء خورشید، بیگم نواب صدیق علی خان کی طرف سے مجھے اقبال کی تمام کتابوں کا سیٹ انعام میں میری جائے سکونت پر بھیجا گیا۔ یہ کتابیں اب بھی میرے کتب خانے میں موجود ہیں جن پر ذیل کی عبارت بیگم صدیق علی خاں کے دستخط کے ساتھ درج ہے :

بیگم صدیق علی خاں کی جانب سے تحفۂ اقبال
مشرقی افریقہ کے نوجوان شاعر رضا کی خدمت میں
علامہ اقبال کے کلام پر اردو میں بہترین مضمون لکھنے

کے سلسلے میں بہ تقریب یوم اقبال ۱۹۵۳ء۔
بیگم صدیق علی خاں
نیروبی مشرقی افریقہ
۱۱ جنوری ۱۹۵۴ء

کتابیں ملنے پر میں نے اسی روز بیگم خورشید آراء خورشید کو ذیل کا قطعہ بطور شکریہ لکھ کر بھیجا ؎

شکریہ آپ نے بھیجا جو کلامِ اقبال
نظم کا نام دوں اس کو کہ نظامِ اقبال
جن کتابوں سے مجھے آپ نے عزت بخشی
ان کے ہر لفظ سے ظاہر ہے مقامِ اقبال
شعر ہیں سامنے اور وجد ہے مجھ پہ طاری
بے پیے مست کئے دیتا ہے جامِ اقبال
فرش کا ذکر ہی کیا عرش سے جو اونچے ہیں
ان مقامات پہ رہتا ہے خرامِ اقبال
قدم انسان کا اٹھتا ہے اجل کی جانب
زندگانی کی طرف بڑھتا ہے گامِ اقبال
صبحِ اقبال کے منظر کا تو کہنا ہی کیا
آنکھ کو خیرہ کیے دیتی ہے شامِ اقبال
فلکِ شعر پہ کتنی بھی گھٹائیں چھا جائیں
چھپ نہیں سکتا کبھی ماہِ تمامِ اقبال
واقعی خوب ملا تحفۂ خورشید آراء
کیا ہی جھوما ہے رضا پا کے پیامِ اقبال

۱۹۵۵ء کے آغاز میں میرا تبادلہ مشرقی افریقہ کی مشہور بندرگاہ ممباسہ میں ہوگیا۔ ممباسہ میں نیروبی ایسی ادبی سرمستیاں کہاں۔ صلاح مشورے کے لیے احباب کے خط آجاتے تو کچھ دیر کی دل لگی کا سامان پیدا ہو جاتا ورنہ خود ہی کہنا، خود ہی سننا۔ یہ کیفیت چندے قائم رہی کہ ایک روز نیروبی کی مشہور لٹریری سوسائٹی "حلقہ گفتوش" کا خط ملا۔ آفیشل خط کے ساتھ سکریٹری کا ذاتی خط (دونوں انگریزی میں) اور مرزا جی کا ذاتی خط اُردو میں یہ تینوں خط ۱۳ اپریل ۱۹۵۵ء کو ملے۔ یومِ اقبال کے لئے جو ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہونا قرار پایا تھا۔ مجھے نیروبی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مرزا جی[1] جو مجھ سے کافی سینئر ہیں اپنے بے تکلفانہ انداز میں لکھتے ہیں :

"........ افراتفری ہے بزمی[2] نے چٹھی ٹائپ کی۔ اکبر ہوٹل سے ٹکٹ لیے سردار محمد[3] کی کار میں جاکر چٹھی پوسٹ ہوئی۔ الحمدللہ......

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

تمہارا خط نہیں آیا نہ سہی مگر تمہارے منتظر ہیں، کل آغا[4] ملے تھے، شیخ صاحب[5] بھی۔ سب تمہاری غیر حاضری سے نالاں ہیں۔"

اس حکم کو ماننے بغیر چارہ نہ تھا گیا اور کشاں کشاں گیا۔ ایک قطعہ جو میں

---

[1] اسحاق مرزا قاری مرحوم، قاری نصیر احمد مرحوم کے صاحبزادے۔

[2] عبدالرحمٰن بزمی۔ اب انگلینڈ میں مقیم ہیں۔

[3] نہیں معلوم اب کہاں ہیں۔

[4] حیدر حسن آغا مرحوم۔ میرے ایک عزیز دوست۔ مجھ سے مشورہ بھی کرتے تھے۔

[5] شیخ عبداللہ ایم۔ اے۔ معلوم نہیں اب کہاں ہیں۔

نے خاص اس موقع کے لیے کہا تھا آپ بھی سنیئے ؎

میں گنہگار تخلص ہوں کہاں شاعر ہوں میں
بات بھی کرنی نہیں آتی روانی سے مجھے
طبع رنگیں کی بدولت زینتِ محفل ہوں میں
واسطہ ورنہ نہیں کچھ خوش بیانی سے مجھے
آتشِ تخلیق نے آتشِ بیاں مجھ کو کیا
شعر نے لے دی روانی بہتے پانی سے مجھے
فکر کے قابل کمالؔ[1] فکر پرور نے کیا
دولتِ شعر آئی جوشؔ ملسیانی سے مجھے
چھوڑ کر نیروبی ممباسہ چلا جانا پڑا
جز مصیبت کے ملا ہی کیا جوانی سے مجھے
خدمتِ شعر و ادب کا پھر سے موقع مل گیا
"حلقۂ گفتوش" تیری مہربانی سے مجھے

اپریل ۱۹۵۵ء میں 'یومِ اقبال' کے سلسلے میں دو جلسے ہوئے ایک حلقۂ گفتوشش کی طرف سے دوسرا پاکستان ہائی کمیشن کی طرف سے۔ میں نے ان دونوں میں شرکت کی اور اقبالؔ کے دو شعروں پر تضمین پیش کی۔ یہ تضمینیں میرے پہلے مجموعۂ کلام 'شعلۂ خاموش' کے صفحہ ۱۰۱ اور صفحہ ۱۰۳ پر درج ہیں۔ اقبال کے دو اشعار یہ ہیں ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

---

[1] کمال کرتارپوری مرحوم۔ جوشؔ ملسیانی کے دورِ اوّل کے شاگرد۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

'یومِ اقبال' کی تقریبات تو بعد میں بھی ہر سال ہوتی رہیں مگر میرے پاس ان کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں رہ سکا یوں بھی نواب صدیق علی خاں کے چلے جانے کی وجہ سے ان کا وہ معیار نہ رہا حتّٰی کہ سردار عبدالغفور[1] پاکستان کے کمشنر ہو کر آ گئے۔ دُور افتادہ اُردو پھر سے تازہ دم ہو گئی۔ شکستہ پائی کے باوجود سفر پھر سے شروع ہو گیا۔ چنانچہ ۱۲ مئی ۱۹۶۷ء کو جو یومِ اقبال ان کی صدارت میں ہوا وہ یادگار ہے۔ تقریب پارک روڈ پر واقع مولا داد نرسری اسکول کے وسیع ہال میں منعقد ہوئی۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میں صدرِ بزمِ سخن کی حیثیت سے شامل تھا۔ میں نے اقبال کی مشہور غزل "جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں" کی تخمیس سنائی تھی۔ مخمس سے پہلے یہ قطعہ پیش کیا تھا۔ جو اس وقت کے احساسات کا ترجمان کہا جا سکتا ہے ؎

اُردو سے رہ گیا تھا ہمیں ربطِ دُور کا
اب پھر سے آ گیا ہے زمانہ سرور کا
نواب کی وہ ہستی گل ریز جا چکی
اب آسرا ادب کو ہے عبدالغفور کا

---

[1] یہ مشہور مسلم لیگی اور پاکستانی لیڈر سردار عبدالرب نشتر کے چھوٹے بھائی تھے۔ شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔

ایک رُباعی بھی یاد آرہی ہے ؎

مستی سے چھلکتا ہے، تہی جام نہیں
اک بات بھی کہنے میں وہ ناکام نہیں
آفاق کی سرحدوں کو جا چھوتا ہے
اقبال فقط شاعرِ اسلام نہیں

مخمّس کے اب دو ہی بند یاد ہیں ؎

طرب انگیز نغموں میں، الم انگیز سینوں میں
درِ کعبہ پہ جھکتی جا رہی مضطر جبینوں میں
نمودِ صبح میں، شبنم کے نازک آبگینوں میں
"جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں"

پسیجے گا نہ اب یہ دل ترے ہنسنے سے رونے سے
خوشامد سے لب خاموش سے موتی پرونے سے
بچا سکتا ہے مجھ کو کون ابد کی نیند سونے سے
"مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں"

اِشاریہ

لوٹ اشاریے (ا) کی ترتیب بلحاظ حروفِ تہجی بیشتر پہلے ہی حروف تک محدود ہے۔
(ب) میں کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے

الف

پ

ش

گ

ل

مطبوعات کالی داس گپتا رضؔا

۱۔ شعلۂ خاموش
۲۔ شورشِ پنہاں
۳۔ شاخِ گُل
۴۔ اُجالے
۵۔ گیت اور بھجن
۶۔ شورِ غم
۷۔ شعاعِ جاوید
۸۔ دی سائلنٹ فلیم
۹۔ اوڈ ٹو ایسٹ ونڈ
۱۰۔ غزل گلاب
۱۱۔ قدسی الہ آبادی اور نعت قدسی
۱۲۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
۱۳۔ علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں
۱۴۔ سہو و سراغ
۱۵۔ فرہنگ عارفاں
۱۶۔ بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں
۱۷۔ منثوراتِ جوشؔ ملسیانی
۱۸۔ مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی
۱۹۔ جوشؔ ملسیانی مع انتخابِ کلام
۲۰۔ چکبست اور باقیاتِ چکبست
۲۱۔ کلیاتِ چکبست
۲۲۔ مقالاتِ چکبست
۲۳۔ چکبست۔ کچھ بازدید کچھ پیش رفت
۲۴۔ انتخاب آتشؔ و غالبؔ از چکبست
۲۵۔ متعلقاتِ غالبؔ
۲۶۔ آبِ حیات میں ترجمۂ غالبؔ
۲۷۔ دعائے صباح
۲۸۔ غالبیات چند عنوانات
۲۹۔ دیوان غالبؔ (۱۸۴۱) عکسی
۳۰۔ دیوانِ غالبؔ (۱۸۶۲) عکسی
۳۱۔ دیوانِ غالبؔ کامل تاریخی ترتیب سے
۳۲۔ دیوانِ غالبؔ متداول تاریخی ترتیب سے
۳۳۔ غالبؔ درونِ خانہ
۳۴۔ غالبؔ کی بعض تصانیف
۳۵۔ پنج آہنگ میں مکاتیبِ غالبؔ
۳۶۔ غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے
۳۷۔ اسد اللہ خانِ غالبؔ مُرد
۳۸۔ بے صبر تلمیذ غالبؔ مع انتخاب کلام
۳۹۔ غالبیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے